قائدِ انقلاب
علامہ فضلِ حق خیرآبادی
یٰس اختر مصباحی
دارالقلم ذاکر نگر دہلی

قائدِ انقلاب

فضل حق خیرآبادی

یٰسٓ اختر مصباحی

بانی وصدر دارالقلم، ذاکرنگر، نئی دہلی ۲۵

بانی رکن المجمع الاسلامی، مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ، یوپی

موبائل: 09350902937

طابع وناشر

ارالقلم-66/92 قادری مسجد روڈ، ذاکرنگر (جوگابائی ایکسٹینشن)

اوکھلا، نئی دہلی-110025 (انڈیا)

فون:011-26986872،فیکس نمبر:011-26987184

سلسلۂ مطبوعات (۲۵)

نام کتاب .... قائدِ انقلاب علامہ فضل حق خیرآبادی

مؤلف .... یٰسٓ اختر مصباحی

زیرِ اہتمام .... دارالقلم، ذاکرنگر، نئی دہلی

طبع اوّل ۱۴۳۱ھ/ ۲۰۱۰ء

صفحات .... ایک سو چھتیس (136)

قیمت .... پچاس روپے (-/50)

رابطہ کا پتہ

دارالقلم-92/66 قادری مسجد روڈ، ذاکرنگر (جوگابائی ایکسٹینشن)

اوکھلا، نئی دہلی-110025 (انڈیا)

فون: 011-26986872

فیکس نمبر: 011-26987184

فہرستِ کتاب

مضامین	صفحات
قائدِ انقلاب	۵
علامہ فضل حق خیرآبادی	۸
ہندوستان میں انگریزوں کی تجارت وحکومت	۲۳
انگریزوں کے لرزہ خیز مظالم	۲۹
ورودِ دہلی اور سرگرم جدوجہد	۴۰
قواعد وضوابط کورٹ	۴۹
سیاسی بصیرت واستقامت اور انقلاب ۱۸۵۷ء	۵۴
فتواے جہاد اور قائدانہ کردار	۷۷
انقلاب کی کہانی، قائدِ انقلاب کی زبانی	۹۵
گردشِ ایام پہ غالب ہواہے فضلِ حق	۱۲۲تا۱۳۶

☆☆☆☆☆☆

انتساب بنام

علماومشائخ ومشاہیرِ اسلام

(۱) مجدد الفِ ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی	وصال	صفر۱۰۳۴ھ/دسمبر۱۶۲۴ء
(۲) عاشقِ رسول شیخ عبدالحق محدث دہلوی	//	ربیع الاول۱۰۵۲ھ/جون۱۶۴۲ء
(۳) ابوالبرکات شیخ عبدالرشید جون پوری	//	رمضان۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء
(۴) عارفِ حق سید شاہ عبدالرزاق قادری بانسوی (بارہ بنکی)	//	۱۱۳۶ھ/۱۷۲۴ء
(۵) صاحبُ البرکات سید شاہ برکت اللہ قادری مارہروی	//	محرم۱۱۴۲ھ/اگست۱۷۲۹ء
(۶) امام الھند شاہ ولی اللہ فاروقی محدث دہلوی	//	۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء
(۷) حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں نقشبندی دہلوی	//	۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء
(۸) حسان الھند سید محمد آزاد بلگرامی (ہردوئی)	//	۱۱۹۹ھ/۱۷۸۵ء
(۹) بحرالعلوم علامہ عبدالعلی فرنگی محلی لکھنوی		۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء
(۱۰) بیھقیِ وقت قاضی ثناء اللہ پانی پتی	//	۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء
(۱۱) حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی	//	۱۲۳۰ھ/۱۸۱۵ء
(۱۲) حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلوی	//	شوال۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء
(۱۳) شمس العارفین سید شاہ آل احمد اچھے میاں برکاتی مارہروی	//	۱۲۳۵ھ/جنوری۱۸۲۰ء
(۱۴) سراج الھند شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی	//	شوال۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء
(۱۵) حضرت شاہ غلام علی نقشبندی دہلوی	//	صفر۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء
(۱۶) حضرت العلام علامہ فضل امام فاروقی خیرآبادی	//	۱۲۴۴ھ/۱۸۲۹ء
(۱۷) حضرت شاہ ابوسعید مجددی رام پوری	//	۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء
(۱۸) حضرت شاہ محمد مخصوص اللہ محدث دہلوی	//	۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء
(۱۹) حضرت شاہ احمد سعید مجددی دہلوی	//	ربیع الاول۱۲۷۷ھ/۱۸۶۰ء
(۲۰) حضرت مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی	//	ربیع الاول۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء
(۲۱) خاتم الاکابر سید شاہ آل رسول احمدی مارہروی	//	ذوالحجہ۱۲۹۶ھ/دسمبر۱۸۷۹ء

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیھم اجمعین۔

عقیدت کیش

یٰسٓ اختر مصباحی

قائدِ انقلاب

وارثِ علومِ نبوی، حاملِ لوائے محمدی، امام الحکمۃ والکلام، قائدِ انقلاب، حضرت العلاّم محمد فضلِ حق خیرآبادی خلف الصدق علامہ فضلِ امام خیرآبادی (صدر الصدور دہلی) وتلمیذِ رشید سراج الھند شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی وشاہ عبدالقادر محدث دہلوی عَلَیھِمُ الرحمۃ والرضوان اپنے عہدو زمان کے فائقُ الامثالِ وَالاُقران فرزندِ ہندوستان تھے۔ جن کے علم وفضل، تدبرو حکمت، بصیرت وفراست، جرأت واستقامت اور صداقتِ گفتاروکردار کانقش لوحِ ذہن اورصفحاتِ تاریخ پہ آج بھی مرتسم اوردرخشندہ وتابندہ ہے۔

علوم وفنونِ خانوادۂ وَلی اللّٰھی وعزیزی دہلی وخانوادۂ فرنگی محلی لکھنؤ کے امین ومجمع البحرین اورسنگم تھے علامہ فضلِ حق خیرآبادی (وصال ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء) اورتاریخ کا ہرطالبِ علم اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ متحدہ ہندوستان کا ہرخطہ انہیں دونوں خانوادوں کے دینی وعلمی فیضان سے سیراب وسرشار ہے اوراکابرواسلافِ سوادِ اعظم اہل سنت وجماعت کا سلسلۂ علم وفن انہیں دونوں خانوادوں سے مربوط ومنسلک ہے۔

سرزمین ہند پہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور ملکہ وکٹوریہ کے ذریعہ برطانوی سامراج کے قبضہ وتسلط کے خلاف قائدِ جنگِ آزادی اورآخری مغل تاج دار بہادرشاہ ظفؔر کی کِنگ کونسل کے رکنِ رکین علامہ فضلِ حق خیرآبادی نے ۱۸۵۷ء میں شاہجہانی جامع مسجد دہلی کے منبر سے جوآواز بلند کی، اپنی تقریر کے ذریعہ انقلاب کا جو ولولہ انگیز پیغام دیا، اپنے فتویٰ کے ذریعہ مردہ دلوں میں جوروح پھونکی اس کی انگڑائی نے قصرِ برطانیہ کی بنیادیں ہلادیں۔ چنانچہ مستند تاریخی روایت ہے کہ:

''علامہ (فضلِ حق خیرآبادی) سے جنرل بخت خاں (روہیلہ) ملنے پہنچے۔ مشورہ کے بعد علامہ نے آخری تیر ترکش سے نکالا۔ بعدِ نمازِ جمعہ جامع مسجد (دہلی) میں علما کے سامنے تقریر کی۔ اِستفتا پیش کیا۔ مفتی صدرالدین خاں آزردہ صدرالصدور دہلی، مولوی عبدالقادر، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولانا فیض احمد (عثمانی) بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیرخاں اکبرآبادی، سید مبارک

شاہ رام پوری۔نے دست خط کیے۔

اس فتویٰ کے شایع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی۔دہلی میں نوے ہزار سپاہ جمع ہوگئی۔(تاریخ عروجِ عہدِ انگلشیہ،مؤلفہ ذکاءاللہ دہلوی)

ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان مہینوں خوں ریز جنگ ہوتی رہی اور متعدد اسباب ووجوہ کے تحت جب یہ انقلاب ناکام ہوکر دار وگیر دقید وبند سے دوچار ہوا تو ۳۰رجنوری ۱۸۵۹ء میں علامہ فضلِ حق خیرآبادی بھی سیتاپور میں گرفتار ہوئے اور لکھنؤ میں آپ کے خلاف مقدمہ چلا۔اس مقدمہ کا ذکر تاریخ میں اس طرح آتا ہے۔

''سرکاری وکیل کے مقابل خود مولانا (فضلِ حق) بحث کرتے تھے۔بلکہ لُطف یہ تھا کہ چند اِلزامات خود اپنے اوپر قائم کیے اور پھر خود مثلِ تارِ عنکبوت عقلی وقانونی اَدِلّہ سے توڑ دیے۔جج یہ رنگ دیکھ کر پریشان تھا......

آپ نے اپنے اوپر جس قدر الزامات قائم کیے تھے،ایک ایک کر کے رد کیا۔اور جس مُخبر نے فتویٰ کی خبر دی تھی،اس کے بیان کی توثیق وتصدیق کی۔اور فرمایا:

اس گواہ نے سچ کہا تھا۔''وہ فتویٰ صحیح ہے۔میرا لکھا ہوا ہے۔آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے''۔(ص ۳۸۔غدر کے چند عُلما۔مؤلفہ مفتی انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی۔مطبوعہ دہلی)

علامہ فضلِ حق خیرآبادی کی جرأت واستقامت کا حال مولانا حسین احمد مدنی (صدر جمعیۃ علماے ہند) کی زبانی سنیے:

''علامہ فضلِ حق اپنے فتواے جہاد پر مفتخر ہیں اور اس الزام سے براءت کے بجاے اس کی پاداش میں سزا بھگتنے کے لئے ہمہ تن تیار......فرمایا! پہلے اس گواہ نے سچ کہا تھا اور رپورٹ بالکل صحیح لکھوائی تھی۔اب عدالت میں میری صورت دیکھ کر مرعوب ہوگیا اور جھوٹ بولا۔

''وہ فتویٰ صحیح ہے۔میرا لکھا ہوا ہے۔اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے''۔

......شیرِ میسور سلطان ٹیپو کی رزم گاہِ شہادت کا یہ فقرہ کبھی نہیں بھلایا جاسکتا۔''شیر کی ایک روزہ زندگی گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے بہتر ہے''۔(ص ۴۴۲،نقشِ حیات،مؤلفہ حسین احمد مدنی)

''قربان جائیے علامہ (فضلِ حق) کی شانِ استقلال پر۔خدا کا شیر گرج کر کہہ رہا ہے کہ میرا اَب بھی وہی فیصلہ ہے کہ انگریز غاصب ہے اور اس کے خلاف جہاد کرنا فرض ہے۔

خدا کے بندے ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔ وہ جان کی پروا کیے بغیر سربکف ہوکر میدان میں نکلتے ہیں اور لومڑی کی طرح ہیر پھیر کر کے جان نہیں بچاتے بلکہ شیروں کی طرح جان دینے کو فخر سمجھتے ہیں۔'' (ص ۶۵۔ تحریک ریشمی رومال۔ از حسین احمد مدنی۔ مطبوعہ کلاسیک لاہور)

بہر حال! ۴؍ مارچ ۱۸۵۹ء کو علامہ فضلِ حق خیر آبادی لکھنؤ کورٹ کے فیصلے کے مطابق عُبور بہ دریائے شور (کالا پانی) کی سزا کے مستحق ہوئے اور جزیرۂ انڈمان (کالا پانی) میں سخت روحانی و ذہنی و جسمانی کرب و اذیت میں مبتلا ہوکر ۱۲؍ صفر المظفر ۱۲۷۸ھ/ ۲۰؍ اگست ۱۸۶۱ء میں اپنے خالق و مالکِ حقیقی سے جاملے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

۲۰۱۱ء میں علامہ فضلِ حق خیر آبادی کے وصال کو ڈیڑھ سو سال پورے ہورہے ہیں۔ اس مناسبت سے یہ کتاب حق پسند و باشعور ہندوستانیوں کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔ اس کتاب کے مشتملات ۲۰۰۷ء میں میری لکھی ہوئی دو کتابوں (۱) علامہ فضلِ حق اور انقلاب ۱۸۵۷ء (۲) چند ممتاز عُلمائے انقلاب ۱۸۵۷ء۔ مطبوعہ ''دار القلم'' ذاکر نگر، نئی دہلی ۲۵۔ ۱۴۲۸ھ/ ۲۰۰۷ء سے ماخوذ ہیں۔

متحدہ ہندوستان (ہندو پاک و بنگلہ دیش) کے احسان شناس باشندوں کا فریضہ ہے کہ وہ علامہ فضلِ حق جیسے عظیم محسنِ قوم و ملت و قائدِ انقلاب کی خدمات اور قربانیوں کو ہمیشہ یاد رکھیں۔ بالخصوص ۲۰۱۱ء کو علامہ موصوف کے نام منسوب کر کے سال بھر کسی نہ کسی انداز سے مختلف تقریبات کے انعقاد اور کتب و مضامین و مقالات کی تحریر و اشاعت کے ذریعہ انہیں خراجِ تحسین و عقیدت پیش کرتے رہیں۔ یہی احسان شناسی کا تقاضہ اور قومی و ملی نیز وطنی فریضہ ہے۔

تِلكَ آثارُنَا تَدُلُّ عَلَيْنا　　　فانظروا بعدنا اِلى الآثار

یہ ہمارے نقوش و آثار ہیں جن کی ہمارے بعد نِگہ داشت کرتے رہنا۔

اللہ تبارک و تعالیٰ ہم سب کو توفیقِ خیر و سعادت عطا فرمائے۔ آمین بجاہِ حبیبہٖ سیدِ المرسلین۔

یٰسٓ اختر مصباحی　　　دوشنبہ مبارکہ۔ ۸؍ ذوالحجہ ۱۴۳۱ھ

بانی و صدر دار القلم، ذاکر نگر، نئی دہلی ۲۵۔　　　۱۵؍ نومبر ۲۰۱۰ء

موبائل: 09350902937

علامہ فضلِ حق خیر آبادی

اپنے وقت کے دو معروف عُلما حضرت مولانا بہاء الدین فاروقی مفتیِ رہتک (پنجاب) اور حضرت مولانا شمس الدین فاروقی مفتیِ بدایوں فرزندانِ شیر الملک بن شاہ عطاء الملک فاروقی کی نسل میں کئی جلیل القدر عُلما پیدا ہوئے۔ حضرت شاہ ولی اللہ بن شاہ عبد الرحیم دہلوی مفتی بہاء الدین اور حضرت علامہ فضلِ حق خیر آبادی بن علامہ فضلِ امام خیر آبادی بن قاضی ارشد ہرگامی مفتی شمس الدین کی اولاد میں سے ہیں۔ (ص۔۱۳۱، باغی ہندوستان از مولانا عبد الشاہد شیروانی)

علامہ فضلِ امام فاروقی خیر آبادی صدر الصدور دہلی (متوفی ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء) جو علامہ فضلِ حق خیر آبادی (متولد ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء۔ متوفی ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء) کے والد ماجد ہیں۔ ان کے بارے میں سر سید احمد خاں (متوفی مارچ ۱۸۹۸ء) لکھتے ہیں:

"اکملِ افرادِ نوعِ انسی، مہبطِ انوار فیوضِ قدسی، سرابِ سرچشمۂ عین الیقین، مؤسسِ اساس ملت و دین، ماحیِ آثارِ جہل، ہادمِ بنائے اعتساف، محیِ مراسمِ علم، بانیِ مبانی انصاف، قدوۂ علمائے فحول، حاویِ معقول و منقول، سندِ اکابرِ روزگار، مرجعِ اعالی و اَدانی ہر دیار، مزاج دانِ شخص کمال، جامع صفاتِ جلال و جمال، موردِ فیضِ ازل و ابد، مطرحِ انظارِ سعادت سرمد، مصداقِ مفہوم اجزائے واسطۃ العقد، سلسلۂ حکمتِ اشراقی و مشائی، زبدۂ کرام، اسوۂ عظام، مقتدائے انام، مولانا و مخدومنا مولوی فضلِ امام ادخلہ اللّٰہ المنعام فی جنۃِ النعیم بلطفہٖ العمیم۔

... علومِ عقلیہ اور فنونِ حکمیہ کو ان کی طبع وقاد سے اعتبار تھا اور علوم ادبیہ کو ان کی زبان دانی سے افتخار۔ اگر ان کا ذہن رسا دلائل قاطعہ بیان نہ کرتا، فلسفہ کو معقول نہ کہتے۔ اور ان کا فکر صائب براہینِ ساطعہ قایم نہ کرتا، اشکال ہندسہ تارِ عنکبوت سے سست تر نظر آتیں۔ اس نواح میں ترویج علم حکمت و معقول کی اسی خاندان سے ہوئی۔ گویا اس دودۂ والا تبار سے اس علم نے یک جہتی پائی۔

باوجود اِن کمالات کے خُلق اور حِلم کا کچھ حساب نہ تھا۔ ہمیشہ سرکار حُکام میں مناصب بلند سے سرفراز اور ابنائے عہد سے ممتاز رہے۔ پایۂ ہمت آپ کا بہت بلند تھا اور سلوک آپ کا حق پسند۔ بہ سبب کثرتِ ایثار کے تنگ دستیِ خلائق دیکھ نہ سکتے تھے اور بہ سبب خلقِ وسیع کے ہر عاجز و

زبوں حال کو عرض و نیاز سے منع نہ کرتے۔ (ص ۵۶۰ و ۵۶۱۔ آثار الصنادید از سرسید احمد خاں)

اسی طرح کے القاب و آداب اور مدح و ستائش کے ساتھ سرسید نے علامہ فضل حق خیر آبادی کا بھی تعارف لکھا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> مستجمع کمالاتِ صوری و معنوی، جامع فضائل ظاہری و باطنی، بِنَاءِ بنائے فضل و افضال، بہار آرائے چمنستان کمال، متکی ارا ایکِ اصابتِ رائے، مسند نشینِ افکار رسا، صاحبِ خلق محمدی، مورد سعادات ازلی و ابدی، حاکمِ محاکمِ مناظرات، فرماں روائے کشورِ محاکمات، عکسِ آئینۂ صافی ضمیری، ثالث اثنین بدیعی و حریری، اَلمعیِ وقت و لوذعیِ زمان، فرزدقِ عہد و لبیدِ دوران، مبطلِ باطل و محققِ حق، مولانا محمد فضل حق۔

یہ حضرت خلف الرشید ہیں جناب مستطاب مولانا فضل امام غفر له الله المنعام کے۔ اور تحصیل علوم عقلیہ و نقلیہ کی اپنے والد ماجد کی خدمتِ بابرکت سے کی ہے۔

زبانِ قلم نے ان کے کمالات پر نظر کر کے فخر خاندان لکھا ہے اور فکر دقیق نے جب سرِّ کار کو دریافت کیا فخر جہاں پایا۔ جمیع علوم و فنون میں یکتائے روزگار ہیں اور منطق و حکمت کی تو گویا انھیں کی فکر عالی نے بنا ڈالی ہے۔ علمائے عصر بل فضلائے دہر کو کیا طاقت ہے کہ اس سرگروہِ اہل کمال کے حضور میں بساطِ مناظرہ آراستہ کرسکیں۔ بارہا دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو یگانۂ فن سمجھتے تھے جب ان کی زبان سے ایک حرف سنا دعوائے کمال کو فراموش کر کے نسبتِ شاگردی کو اپنا فخر سمجھے۔ (ص ۵۶۲۔ آثار الصنادید از سرسید)

علامہ فضل حق نے اپنے والد علامہ فضل امام اور حضرت شاہ عبد القادر محدث دہلوی و حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی سے تعلیم و تربیت حاصل کی۔ ۱۲۲۵ھ/ ۱۸۰۹ء میں بعمر تیرہ سال تمام علوم نقلیہ و عقلیہ کی تکمیل کر لی۔ ایک مدت تک درس و تدریس میں مصروف رہے، اور پھر اواخر ۱۸۱۵ء میں سرکاری ملازمت سے وابستہ ہو گئے۔ اس کے بعد ۱۸۳۱ء میں نواب فیض محمد خاں والی جھجر (صوبہ پنجاب) نے قدردانی کے ساتھ آپ کو اپنے یہاں بلایا اور پانچ سو روپے ماہانہ نذرانہ پیش کرتے رہے۔

دہلی سے جھجر روانگی کے وقت بہادر شاہ ظفر نے اپنا ملبوس دوشالہ علامہ فضل حق خیر آبادی کو

اٹھایا اور آب دیدہ ہوکر کہا۔ چوں کہ آپ جانے کو تیار ہیں۔ میرے لئے بجز اس کے کوئی چارۂ کار نہیں کہ میں بھی اس کو منظور کروں مگر خدا علیم ہے کہ لفظ وداع زبان پر لانا دشوار ہے۔

مرزا غالب نے اپنے ایک خط میں اس واقعہ کا مؤثر انداز میں ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> بالجملہ بعد ازیں استعفا نواب فیض محمد خاں (رئیس جھجر) پانصد روپیہ برائے مصارف ماہانہ خدام مخدومی معین کردونز دخود خواند۔ روزے کہ مولوی فضل حق ازیں دیار رفت ولی عہد خسروِ دہلی صاحب عالم مرزا ابوظفر بہادر............دو شالۂ ملبوس خاص بہ دوشِ وے نہاد۔ وآب در دیدہ گردانید وفرمود کہ:
> ہرگاہ شما می گوئید کہ من رخصت می شوم مرا جز ایں کہ بہ پذیرم گریز نیست۔ اما ایزد دانا داند کہ لفظ وداع از دل بہ زباں نمی رسد اِلا بصد جرِ ثقیل۔ (یادگارِ غالب مطبوعہ دہلی)

جھجر (پنجاب) کے بعد علامہ فضل حق خیر آبادی نے مہاراجہ اُلور کی دعوت پر ریاست الور پھر نواب ٹونک ونواب رام پور کی دعوت پر ٹونک ورام پور میں ملازمت کی۔ رام پور کے بعد لکھنؤ کے صدر الصدور اور ''حضور تحصیل'' کے مہتمم بنائے گئے۔ سہارن پور میں بھی دو سال تک کسی بڑے عہدے پر فائز رہے۔ ایک عرصہ تک عدالتِ دہلی کے سر رشتہ دار بھی رہے۔

محمد حسین آزاد کلام غالب کے انتخاب اور دیوان غالب کے تعلق سے اپنی معلومات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''سن رسیدہ اور معتبر لوگوں سے معلوم ہوا کہ حقیقت میں ان کا دیوان بڑا تھا۔ یہ منتخب ہے۔ مولوی فضل حق صاحب خیر آبادی فاضل بے عدیل تھے جو ایک زمانے میں دہلی کی عدالتِ ضلع میں سر رشتہ دار تھے۔...... انھوں نے اکثر غزلوں کو سنا اور دیوان کو دیکھا تو مرزا صاحب کو سمجھایا کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے۔ مرزا نے کہا جو کچھ کرچکا اب کیا تدارک ہوسکتا ہے؟ انھوں نے کہا خیر جو ہوا سو ہوا۔ انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو۔ مرزا صاحب نے دیوان حوالے کردیا۔ دونوں صاحبوں نے دیکھ کر انتخاب کیا۔ وہ یہی دیوان ہے جو آج عینک کی طرح لوگ آنکھوں سے لگائے

پھرتے ہیں۔ (آب حیات از محمد حسین آزاد مطبوعہ دہلی)

مولانا عبدالشاہد شیروانی علی گڑھی لکھتے ہیں:

''والد ماجد کے انتقال کے وقت علامہ کی عمر بتیس سال تھی۔ اکبر شاہ ثانی کا زمانہ تھا۔ دہلی میں ریزیڈنٹ رہا کرتا تھا۔ اس کے محکمہ کے سررشتہ دار ہوگئے۔ (ص ۱۴۸۔ باغی ہندوستان۔ از عبدالشاہد شیروانی)

مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی و علامہ فضل حق خیرآبادی و مرزا اسداللہ غالب کے باہمی ربط و تعلق کے بارے میں مولانا عبدالشاہد شیروانی لکھتے ہیں:

''مرزا غالب سے علامہ کے پر خلوص اور گہرے تعلقات تھے۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ دونوں بالکل ہم سن تھے۔ دونوں ۱۲۱۲ھ/ ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔ مفتی صدرالدین خاں آزردہ ''ثالث ثلٰثہ'' تھے۔ یہ تینوں ایک جسم کے لئے ''ابعاد ثلٰثہ'' (طول، عرض، عمق) کا حکم رکھتے تھے۔ جس طرح جسم اپنے ابعاد کے بغیر نہیں سمجھا جاسکتا اسی طرح ان تینوں کو جسم خلوص و محبت سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ مفتی صاحب دونوں سے آٹھ سال بڑے تھے۔ (ص ۱۵۷۔ باغی ہندوستان)

دہلی میں علماء کی دو جگہ نشست تھی۔ ایک علامہ (فضل حق) کے یہاں، دوسرے مفتی صدرالدین آزردہ کے دولت کدہ پر۔ علامہ کے علمی دربار میں آٹھویں روز شعرائے دہلی کا اجتماع ہوتا تھا۔ غالب، صہبائی، مومن، آزردہ، احسان، نیر، نثار، شیفتہ، ضمیر، ممنون، نصیر، وغیرہم۔

علماء میں مولوی عبداللہ خاں علوی، مولوی عبدالخالق، مولوی محبوب علی، مولوی نصیرالدین نافع، مولوی کریم اللہ، مولوی نورالحسن، مولوی کرامت علی، مولوی مملوک علی، مفتی سید رحمت علی، مولوی امان علی، مولوی محمد جان، مولوی محمد رستم علی خاں وغیرہم۔

......اندازہ لگایئے کہ اکبر بادشاہ کے شاہی دربار سے یہ دربار کسی طرح کم تھے؟ بادشاہ نے لاکھوں روپے صرف کرکے نورتن جمع کیے تھے۔ اور ان شاہانِ علم نے اپنے حسنِ اخلاق سے سینکڑوں باکمال حضرات کو درباری بنالیا تھا۔ (ص ۱۶۲ و ۱۶۳۔ باغی ہندوستان از عبدالشاہد شیروانی)

''علامہ فضل حق خیرآبادی ۱۸۵۶ء میں لکھنؤ چھوڑ کر ریاست الور چلے گئے۔ اس دوران

آپ کے دل دماغ میں انقلاب کی آہٹ صاف محسوس ہو رہی تھی۔ مہاراجہ الور کو آپ نے اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کی مگر اس میں کامیابی نہیں مل سکی۔ پھر آپ نے جو کچھ کیا اسے اس روزنامچہ کے آئینے میں دیکھا جا سکتا ہے۔

''علامہ الور سے نشر و اشاعت کرتے ہوئے مئی ۱۸۵۷ء میں دہلی پہنچے۔ میرٹھ اور دوسری چھاؤنیوں میں کارتوسوں کا قضیہ زور پکڑ چکا تھا۔ گائے اور سور کی چربی کی آمیزش کی خبر سے ہندو اور مسلمان فوجی بگڑ بیٹھے۔ روٹی کی ٹکیا کی تقسیم کسی خاص اسکیم کے ماتحت گاؤں گاؤں پہلے سے ہو ہی چکی تھی۔

میرٹھ سے دہلی پر ''باغی'' فوج نے ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء کو حملہ کر دیا۔ قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا۔ بادشاہِ دہلی سرگرمیوں کا مرکز بنے۔ علامہ بھی شریک مشورہ رہے۔ منشی جیون لال اپنے روزنامچہ میں لکھتے ہیں:

> ۱۶ر اگست ۱۸۵۷ء: مولوی فضل حق شریک دربار ہوئے۔ انھوں نے اشرفی نذر پیش کی اور صورتِ حال سے متعلق بادشاہ سے گفتگو کی۔
>
> ۲ر ستمبر ۱۸۵۷ء: بادشاہ دربار عام میں تشریف فرما ہوئے۔ مرزا الٰہی بخش، مولوی فضل حق، میر سعید علی خاں، اور حکیم عبدالحق آداب بجا لائے۔
>
> ۶ر ستمبر ۱۸۵۷ء: مولوی فضل حق نے اطلاع دی کہ متھرا کی فوج آگرہ چلی گئی ہے اور انگریزوں کو شکست دینے کے بعد شہر پر حملے کر رہی ہے۔
>
> ۷ر ستمبر ۱۸۵۷ء: بادشاہ دربار خاص میں رہے۔ حکیم عبدالحق، میر سعید علی خاں، مولوی فضل حق، بدرالدین خاں اور دیگر تمام امرا و رؤسا شریکِ دربار رہے۔ (ص ۲۱۷، ۲۴۰، ۲۴۶، ۲۴۷۔ روزنامچہ منشی جیون لال)

اس روزنامچہ سے علامہ کی باخبری اور انقلابی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ (ص ۲۱۴۔ باغی ہندوستان از عبدالشاہد شیروانی علی گڑھی)

''علامہ سے جنرل بخت خاں ملنے پہنچے۔ مشورہ کے بعد علامہ نے آخری تیر ترکش سے نکالا۔ بعد نماز جمعہ جامع مسجد (دہلی) میں علما کے سامنے تقریر کی۔ استفتا پیش کیا۔ مفتی صدرالدین خاں آزردہ صدر الصدور دہلی، مولوی عبدالقادر، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولانا فیض

احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبرآبادی، سید مبارک شاہ رام پوری نے دستخط کیے۔ اس فتویٰ کے شایع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی۔ دہلی میں نوے ہزار سپاہ جمع ہوگئی تھی۔
(تاریخ عروج عہد انگلشیہ از ذکاء اللہ دہلوی بحوالہ ص ۲۱۵۔ باغی ہندوستان)

پروفیسر خلیق احمد نظامی شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ لکھتے ہیں:

> پھر اقتصادی اعتبار سے بھی یہ حقیقت فراموش نہیں کی جاسکتی کہ ہندوستانی سپاہی جو بہادر شاہ کے گرد جمع ہوگئے تھے انھیں سخت ترین مالی دشواریاں پیش آرہی تھیں۔ آئے دن فوج کے ضروری اخراجات کے لئے روپیہ قرض لینے کی ضرورت پڑتی تھی۔ ایسی صورت میں کوئی فوج بے فکری کے ساتھ کام نہیں کرسکتی تھی۔ منشی جیون لال نے اپنے روزنامچہ میں بہادر شاہ اور مولوی فضل حق کی گفتگو نقل کی ہے۔
>
> بہادر شاہ نے جب مولوی صاحب کو حکم دیا کہ "اپنی افواج کو لڑانے کے لئے لے جاؤ اور انگریزوں کے خلاف لڑاؤ"
>
> تو انھوں نے کہا۔ "افسوس تو اسی بات کا ہے کہ سپاہی ان کا کہا نہیں مانتے جو ان کی تنخواہ دینے کے ذمہ دار نہیں۔" (ص ۲۲۰۔ غدر کی صبح وشام۔ بحوالہ ص ۳۵۔ مقدمہ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ۔ مؤلفہ خلیق احمد نظامی مکتبہ ندوۃ المصنفین اردو بازار دہلی ۱۹۷۱ء)

۱۴؍ستمبر ۱۸۵۷ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے دہلی پر پوری طاقت وقوت کے ساتھ حملہ کیا اور ۱۹؍ستمبر کو دہلی پر اس کا مکمل قبضہ ہوگیا۔ بہادر شاہ ظفر قلعہ ہمایوں سے ۲۱؍ستمبر کو گرفتار کرلیے گئے۔ جنرل بخت خاں، ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی، مولانا فیض احمد بدایونی وغیرہم لکھنؤ چلے گئے۔ اور مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی کے پرچم کے نیچے جمع ہوکر انگریزوں سے لڑتے رہے۔ آخر میں شاہجہاں پور پہنچے اور اپنی حکومت قائم کرلی پھر آخری شکست کے بعد روپوش ہوتے ہوئے نیپال گئے۔ اس کے بعد کسی کا کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ البتہ بلدیو سنگھ راجہ پوائیں شاہجہاں پور کی غداری سے مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی ۲؍ذوالقعدہ ۱۲۷۴ھ/ ۱۵؍جون ۱۸۵۸ء کو شہید ہوگئے اور جہان آباد (شاہجہان پور) میں آپ کا سر مدفون ہوا۔

علامہ فضل حق ۲۴ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی سے نکل کر کسی طرح اودھ پہنچے۔ جہاں لکھنؤ میں ۱۲۷۵ھ/ ۱۸۵۹ء میں آپ پر مقدمہ چلا اور کالا پانی کی سزا ہوئی۔ وہیں ۱۲ر صفر ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء میں آپ کا انتقال ہوگیا۔ آپ کے دوست مرزا غالب نے انتقال کی خبر سنی تو شیخ لطیف احمد بلگرامی کے نام اپنے ایک خط میں لکھا:

"کیا لکھوں اور کہوں؟ نور آنکھوں سے جاتا رہا اور دل سے سرور۔ ہاتھ میں رعشہ طاری ہے۔ کان سماعت سے عاری ہے۔

عتاب عروساں در آمد بجوش
صراحی تہی گشت و ساقی خموش

فخرِ ایجاد و تکوین مولانا فضلِ حق ایسا دوست مرجائے۔ غالب نیم مردہ، نیم جاں رہ جائے۔

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی موت آتی ہے پر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی اب کسی بات پر نہیں آتی

(ص ۳۲۔ اردوئے معلی علی گڑھ۔ دسمبر ۱۹۰۷ء)

علامہ فضل حق خیر آبادی پر جرم بغاوت کی دفعات اس طرح عاید کی گئی تھیں:

بہ عدالت لکھنؤ۔ مؤرخہ ۱ر۲ر۴ر مارچ ۱۸۵۹ء

بہ اجلاس لفٹنٹ جی کیمبل جوڈیشیل کمشنر آف اودھ و میجر بیرو، سی، ایم، او فشٹنگ، کمشنر خیر آباد ڈویژن۔

مولوی فضل حق پر مندرجہ ذیل الزامات عاید کیے گئے۔

بغاوت اور قتل کی سازش

نکتہ (۱): ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء میں باغی سرکار کی حیثیت میں دہلی، اودھ اور دوسری جگہوں پر بغاوت اور قتل میں مدد دی۔

نکتہ (۲): بونڈی (اودھ) میں ماہ مئی ۱۸۵۸ء میں باغی سردار ممو خاں (اودھ) کے مشیرِ خاص کی حیثیت سے نمایاں کام انجام دیا۔

نکتہ (۳): بونڈی میں ماہ مئی ۱۸۵۸ء میں ملازم عبدالحکیم سرکار انگلشیہ کے خلاف سازش قتل کی۔

عدالت نے قیدی کو مندرجہ ذیل وجوہ پر مجرم قرار دیا:

(۱) ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء میں باغیوں کی کونسل میں خاص کام انجام دیے۔ خاص طور پر باغی سردار ممو خاں کے مشیر خاص کی حیثیت سے اس نے ایسے اصولوں کی اشاعت کی جس سے قتل کے امکانات پیدا ہوئے۔

۴؍مارچ کو مجرم کو عمر قید بعبور دریائے شور بحیثیت قیدی سرکار انگلشیہ اور ضبطیِ جائداد کی سزا دی گئی — لکھنؤ۔ ۴؍مارچ ۱۸۵۹ء

...... اس مقدمہ کی مزید تحقیق و تفصیل کے لئے باغی ہندوستان مرتبہ عبدالشاہد شیروانی کا مطالعہ کیا جائے جس میں اس سلسلے میں کافی مستند مواد پیش کر دیا گیا ہے۔

مولانا انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی لکھتے ہیں:

"۱۸۵۹ء میں سلطنتِ مغلیہ کی وفاداری یا فتوائے جہاد یا جرمِ بغاوت میں مولانا ماخوذ ہوکر سیتاپور سے لکھنؤ لائے گئے۔ مقدمہ چلا۔ مولانا موصوف کے فیصلے کے لئے جیوری بیٹھی۔ ایک اسیسر نے واقعات سن کر بالکل چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔

سرکاری وکیل کے مقابل خود مولانا بحث کرتے تھے۔ بلکہ لطف یہ تھا کہ چند الزامات خود اپنے اوپر قائم کیے اور پھر خود مثلِ تارِ عنکبوت عقلی و قانونی ادلہ سے توڑ دیے۔ جج یہ رنگ دیکھ کر پریشان تھا اور ان سے ہم دردی بھی تھی۔ کرے تو کیا کرے؟ ظاہر یہ ہو رہا تھا کہ مولانا بری ہوجائیں گے۔ سرکاری وکیل لاجواب تھے۔

...... دوسرا دن آخری دن تھا۔ آپ نے اپنے اوپر جس قدر الزامات عاید کیے تھے ان کو ایک ایک کر کے رد کیا۔ اور جس مخبر نے فتویٰ کی خبر دی اس کے بیان کی توثیق و تصدیق کی اور فرمایا! اس گواہ نے سچ کہا تھا۔ وہ فتویٰ صحیح ہے۔ میرا لکھا ہوا ہے۔ اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے۔

چنانچہ اس کے بعد بے حد رنج کے ساتھ عدالت نے حبسِ دوام کا حکم سنایا۔ آپ نے مسرت سے منظور کیا۔ یہ جج آپ سے کام سیکھ چکا تھا۔ الخ (ص ۳۷، ۳۸۔ غدر کے چند علما)

مولانا شیروانی لکھتے ہیں:

"بغاوت وسط مئی ۱۸۵۷ء میں شروع ہوئی۔ جوں ہی اس کی اطلاع ملی علامہ اہل خانہ کو

الور چھوڑ کر دہلی آ گئے۔ اور سرگرمی سے بغاوت کی رہنمائی اور حکومت کے دستور العمل کی ترتیب شروع کر دی۔ جولائی میں جنرل بخت خاں کے دہلی آنے پر فتوائے جہاد مرتب کر کے علما کے دستخط کرائے۔ اسی دوران راجہ الور بنے سنگھ کی خبر ارتحال پر الور چلے گئے۔ تقریباً ایک ماہ میں واپس دہلی آ گئے۔ پھر ۱۵ یوم دہلی میں قیام کر کے الور آ گئے اور اپنے اہل وعیال کو لے کر اوائلِ ستمبر میں دہلی آ گئے۔ وسطِ ستمبر ۱۸۵۷ء میں دہلی پر انگریزوں کا مکمل قبضہ ہوگیا۔ (ص ۲۶۔ باغی ہندوستان از عبد الشاہد شیروانی)

مولوی فضل حق کی اشتعال انگیزیوں سے متأثر ہو کر شہزادے بھی میدان میں نکل آئے اور سبزی منڈی کے پھل والے محاذ پر صف آرا ہیں۔ (اخبار دہلی۔ رپورٹ تراب علی)

مولوی فضل حق اپنے مواعظ سے عوام کو مسلسل بھڑ کا رہے ہیں۔ (اخبار دہلی ۲۷۳۔ فائل ۱۲۷۔ رپورٹ از چنی لال)

بادشاہ نے جنرل بخت خاں، مولوی سرفراز علی اور مولوی فضل حق پر مشتمل رِنگ کونسل بنائی (دی گریٹ ریولیشن آف ۱۸۵۷ء۔ ص ۱۲۸، ۱۸۳)

ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر اپنی مشہور کتاب ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' میں علامہ فضل حق خیرآبادی کے صاحبزادے مولانا عبد الحق خیرآبادی (متوفی ۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۸ء) جو ایک زمانہ میں صدر المدرسین مدرسہ عالیہ کلکتہ تھے ان کے بارے میں لکھتا ہے:

> ''موجودہ ہیڈ مولوی اس عالم دین کے صاحبزادے ہیں جن کو ۱۸۵۷ء کے غدر نے نمایاں کر دیا تھا اور جنھوں نے اپنے جرموں کا خمیازہ اس طرح بھگتا تھا کہ بحر ہند کے ایک جزیرہ میں تمام عمر کے لئے جلا وطن کر دیے جائیں۔ اس غدار عالمِ دین کا کتب خانہ جس کو حکومت نے ضبط کر لیا تھا اب کلکتہ کالج میں موجود ہے۔ (ص ۲۰۲ و ۲۰۳۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان از ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر۔ مطبوعہ الکتاب انٹرنیشنل، نئی دہلی ۲۵)

مولانا امداد صابری دہلوی لکھتے ہیں:

دہلی میں آزادی کی تحریک ۱۸۵۷ء میں شروع ہو چکی تھی۔ مولانا فضل حق کے ساتھیوں نے جہاد کا فتویٰ مرتب کیا۔ اس کی تائید و تصدیق مفتی صدر الدین آزردہ نے فرمائی۔ عمل مولانا امام

بخش صہبائی نے کیا۔نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ بھی پروگرام کے مطابق ولی داد خاں کے ساتھ بغاوت کی آگ لگانے میں مصروف ہوگئے۔معرکے ہوئے۔جنگی صلاحیت قوم میں نہیں تھی اس لئے شکست ہوئی۔(ص ۹۔داستانِ شرف از امداد صابری مطبوعہ دہلی)

مولانا سعید احمد اکبرآبادی فاضل دیوبند سابق صدر شعبۂ سنی دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ لکھتے ہیں:

اس وقت ہمارے سامنے فتویٰ کی جو نقل ہے اس پر دلی کے ۳۸ علما و مشائخ کے دستخط ہیں۔ مولانا فضل حق خیرآبادی کے اس پر دستخط نہیں ہیں لیکن ان کا ایک الگ مستقل فتوائے جہاد تھا جس کا ذکر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی اسلامی تاریخوں میں تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔

مولانا بلند پایہ عالم دین ہونے کے ساتھ رئیسانہ طور طریق زندگی رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود ان کی ایمانی جرأت و جسارت اور دینی حمیت و غیرت کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے ہر چیز سے بے نیاز ہو کر دلی کی جامع مسجد میں نماز جمعہ کے بعد جہاد کے واجب ہونے پر ایک نہایت ولولہ انگیز تقریر کی اور اس کے بعد جہاد کے ایک اور فتویٰ کا اعلان ہوا جس پر صدر الصدور مفتی صدر الدین خاں آزردہ، مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبرآبادی اور دوسرے علما کے دستخط تھے۔(ص ۴۲۔ہندوستان کی شرعی حیثیت از سعید احمد اکبرآبادی، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۶۸ء)

رئیس احمد جعفری ندوی لکھتے ہیں:

مولانا فضل حق خیرآبادی ایک یگانۂ روزگار عالم تھے۔عربی زبان کے مانے ہوئے ادیب اور شاعر تھے۔علوم عقلی کے امام اور مجتہد تھے۔اور ان سب سے بالا ان کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ بہت بڑے سیاست داں، مفکر اور مدبر بھی تھے۔مسندِ درس پر بیٹھ کر وہ علوم و فنون کی تعلیم دیتے تھے اور ایوانِ حکومت میں پہنچ کر وہ دوررس فیصلے کرتے تھے۔وہ بہادر اور شجاع بھی تھے۔

غدر کے بعد نہ جانے کتنے سورما اور رزم آرا ایسے تھے جو گوشۂ عافیت کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔لیکن مولانا فضل حق ان لوگوں میں تھے جو اپنے کیے پر نادم اور پشیماں نہیں تھے۔انھوں نے سوچ سمجھ کر میدان میں قدم رکھا تھا اور اپنے اقدام و عمل کے نتائج بھگتنے کے لئے وہ حوصلہ مندی اور دلیری کے ساتھ تیار تھے۔سراسیمگی، دہشت، اور خوف یہ ایسی چیزیں تھیں جن سے مولانا بالکل ناواقف تھے۔

مولانا کی شخصیت، سیرت، کردار اور علم وفضل پر ضرورت تھی کہ ایک مفصل کتاب لکھی جاتی، لیکن وہ ایک زود فراموش قوم کے فرد تھے، فراموش کر دیے گئے۔ اور کچھ دنوں کے بعد لوگ حیرت سے دریافت کریں گے کہ — یہ کون بزرگ تھے؟ (ص ۸۵۴۔ بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد مؤلفہ رئیس احمد جعفری ندوی۔ طبع اول کتاب منزل لاہور)

علامہ فضل حق خیر آبادی امام الحکمۃ والکلام و قائد جنگ آزادی ہونے کے ساتھ بلند پایہ مصنف بھی ہیں۔ آپ کی تصانیف کی تعداد تقریباً دو درجن ہے۔ منطق و فلسفہ کے دقیق فنی مباحث پر آپ کی کئی ایسی تصانیف وحواشی ہیں جنھیں آج کے ہند و پاک میں بدقت تمام چند علما ہی سمجھ پائیں گے۔ اکثر تصانیف غیر مطبوعہ ہیں۔

تقویۃ الایمان از شاہ محمد اسمٰعیل دہلوی (متوفی ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء) کے بطن سے پیدا ہونے والے سنگین مسائل مثلاً امکانِ کذب باری تعالیٰ و امکانِ نظیر محمدی و تخفیفِ شان رسالت کے جواب میں "امتناع النظیر" اور "تحقیق الفتویٰ فی ابطالِ الطغویٰ" کے نام سے آپ کی دو کتابیں چھپ چکی ہیں۔

محمود احمد برکاتی ٹونکی (کراچی) لکھتے ہیں:

شاہ عبدالعزیز اور ان کے بھائیوں کے اخلاف و تلامذہ میں فکر و نظر کے اختلاف اور مذہب و مسلک کے تعدّد نے دو گروہ پیدا کر دیے تھے۔ ایک گروہ جس کے سربراہ شاہ محمد اسمٰعیل شہید تھے شخص معین کی تقلید کے وجوب کا منکر اور کسی حد تک محمد بن عبدالوھاب نجدی کا ہم نوا تھا۔ اور دوسرا گروہ شاہ عبدالعزیز کے مسلک کا متبع، حنفیت پر مطمئن و مُصر "حکم بالکفر والشرک" کے باب میں محتاط تھا۔ مختصر یہ کہ جادۂ اعتدال سے منحرف نہیں ہوا تھا۔ شاہ محمد موسیٰ (فرزند شاہ رفیع الدین فرزند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی) اس دوسرے گروہ کے حامی و ناصر تھے۔

علامہ فضل حق خیر آبادی نے جو حزب عزیزی کے گویا قائد و نقیب تھے شاہ محمد اسمٰعیل کے متشددانہ افکار و نظریات کے رد میں سبقت کی اور "تحقیق الفتویٰ فی اِبطال الطغویٰ" کے نام سے ایک مفصل رسالہ میں دلائل عقلی و نقلی کے ساتھ شاہ شہید کا رد کیا تو اس کے آخر میں جن ولی اللّٰھی اور عزیزی علما و فضلا کے دستخط تھے ان میں شاہ محمد موسیٰ بھی تھے۔ پھر یہ اختلاف ان دونوں گروہوں کو شاہ جہاں کی مسجد جامع میں منعقد ایک مجلس مناظرہ میں لے گیا تو اس میں

بھی شاہ محمد موسیٰ سرگرم نظر آتے ہیں۔(ص ۱۸۵و۱۸۶۔شاہ ولی اللہ اور ان کے اصحاب، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی ۲۵)

"الثورة الهندية" (باغی ہندوستان) انقلاب آزادی کا ایک مستند ترین ماخذ ہے۔اس کے کئی ایک مخطوطے مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں آج بھی موجود ہیں۔اسے اور قصائد فتنة الهند (منظوم) کو علامہ فضل حق نے جزیرۂ انڈمان (کالا پانی) سے ۱۲۷۷ھ/ ۱۸۶۰ء میں بذریعہ حضرت مفتی عنایت احمد کاکوروی (متوفی ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء) اپنے فرزند سعید و شاگرد رشید مولانا عبدالحق خیرآبادی (متوفی ۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۸ء) کے پاس کوئلہ و پنسل سے کپڑا وغیرہ پر لکھ کر بحفاظت تمام بھیجا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد (متوفی ۱۹۵۸ء) کے والد ماجد حضرت مولانا خیرالدین دہلوی (متوفی ۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء) علامہ فضل حق کے اور خود مولانا آزاد مولانا نظیرالحسن امیٹھوی تلمیذ مولانا عبدالحق خیرآبادی کے شاگرد تھے۔مولانا ابوالکلام باغی ہندوستان مرتبہ عبدالشاہد شیروانی کے پہلے ایڈیشن از مدینہ پریس بجنور ۱۹۴۷ء کے تعارف (محررہ ۲۱/اگست ۱۹۴۶ء) میں لکھتے ہیں:

''والد مرحوم نے معقولات کی تکمیل مولانا مرحوم سے کی تھی اس لئے ان کی مصنفات اور حالات سے خاص علاقہ رکھتے تھے۔مولانا کے فرزند مولانا عبدالحق مرحوم نے یہ رسالہ خود اپنے قلم سے نقل کر کے والد مرحوم کو مکہ معظمہ بھیجا تھا۔چنانچہ وہ میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔

مولوی عبدالشاہد صاحب شیروانی نے جب مجھ سے اس رسالہ کی تصحیح و اشاعت کے ارادہ کا ذکر کیا تو مجھے نہایت خوشی ہوئی۔(ص ۲۳۔باغی ہندوستان)

علامہ فضل حق خیرآبادی کے چند مشہور شاگردوں کے نام یہ ہیں:

مولانا عبدالقادر عثمانی بدایونی (متوفی ۱۳۱۹ھ/ ۱۹۰۱ء) مولانا ھدایت اللہ رام پوری ثم جون پوری (متوفی ۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء) مولانا فیض الحسن سہارن پوری (متوفی ۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۷ء) مولانا سید عبداللہ بلگرامی (متوفی ۱۳۰۵ھ/ ۱۸۸۸ء) مولانا ھدایت علی بریلوی (متوفی ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء) مولانا عبدالعلی رام پوری (متوفی ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۶ء) مولانا نوراحمد بدایونی (متوفی ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۴ء) مولانا نورالحسن کاندھلوی (متوفی ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء) مولانا غلام قادر گوپاموی، مولانا قلندر علی زبیری وغیرہم۔

مولانا عبدالعلی رام پوری تلمیذ علامہ فضل حق خیرآبادی سے فقیہ اسلام مولانا احمد رضا بریلوی (متوفی ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء) نے علم ہیئت کی تعلیم حاصل کی تھی۔ مولانا عبدالحق خیرآبادی فرزند علامہ فضل حق خیرآبادی کے ایک معروف شاگرد مولانا حکیم سید برکات احمد ٹونکی (متوفی ۱۳۴۷ھ/ ۱۹۲۸ء) تھے۔ مولانا ھدایت اللہ جون پوری تلمیذ علامہ فضل حق خیرآبادی کے شاگرد رشید مولانا محمد امجد علی اعظمی (متوفی ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۸ء) ومولانا یار محمد بندیالوی (متوفی ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۷ء) ومولانا سید سلیمان اشرف (بہاری ثم علی گڑھی متوفی ۱۳۵۸ھ/ ۱۹۳۹ء) تھے۔ مؤخر الذکر دونوں حضرات (مولانا ٹونکی ومولانا جون پوری) کے ذریعہ خیرآبادی سلسلۂ تعلیم کو کافی فروغ حاصل ہوا۔

علامہ فضل حق خیرآبادی کے صاحبزادے مولانا عبدالحق خیرآبادی کے بارے میں رئیس احمد جعفری ندوی لکھتے ہیں۔

مولانا عبدالحق خیرآبادی اپنے علم وفضل اور منطق وفلسفہ میں بے نظیر قابلیت اورمہارت کے باعث سارے ہندوستان میں بلند ترین منصب پر فائز تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی سے یہ ثابت کردیا کہ دولت علم کے مقابلے میں دولت دنیا ہیچ ہے۔

مولانا عبدالحق مولانا فضل حق کے فرزند اکبر تھے۔ ۱۸۲۸ء/ ۱۲۴۴ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد سے تحصیل علم کی۔ سولہ سال کی عمر میں سند فضیلت حاصل کرکے درس وتدریس میں مشغول ہوگئے۔ کچھ دنوں ٹونک میں رہے۔ پھر نواب کلب علی خاں نے رام پور بلالیا اوراپنے پوتے حامد علی خاں کا اتالیق مقرر کیا۔ ۱۸۶۵ء/ ۱۲۸۱ھ سے ۱۸۸۶ء/ ۱۳۰۴ھ تک یعنی نواب کلب علی خاں کی تمام مدت حکومت تک رام پور میں رہے۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد کلکتہ گئے۔ وہاں حاکم مرافعہ اور مدرسہ عالیہ کلکتہ کے افسر رہے۔ شمس العلما کا خطاب پایا۔ وہاں سے ۱۸۹۶ء/ ۱۳۱۴ھ میں نواب حامد علی خاں نے رام پور بلالیا۔ اور خود تلمذ اختیار کیا۔ یہاں سے بیمار ہوکر وطن خیرآباد گئے۔ اور ۱۸۹۸ء میں انتقال ہوا۔

مولانا عبدالحق خیرآبادی اپنے زمانہ کے امام فلسفہ تھے۔ آپ کے شاگردوں میں متعدد نامور علما نکلے۔ مولانا نے چالیس کے قریب کتابیں تصنیف کیں۔ (ص ۵۵۳۔ بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد از رئیس احمد جعفری مطبوعہ لاہور)

مفتی انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی لکھتے ہیں:

(مولانا فضل حق خیر آبادی) انڈمان پہنچے۔ استاذ نا محمد عمر انصاری بخاری اکبر آبادی اپنے استاذ کی زبانی کہتے تھے کہ مولانا کو خدمت ذلیل درجہ کی دی گئی تھی۔

جیل سپرنٹنڈینٹ ایک شریف انگریز تھا۔ مشرقی علوم سے واقف اور فنِ ہیئت کا ماہر تھا۔ اس کی پیشی میں ایک سزایافتہ مولوی بھی تھے۔ اپنی تصنیف کردہ کتاب ہیئت جو فارسی میں تھی وہ ان کو دی کہ عبارت صحیح و درست کردیں۔

مولوی صاحب سے تو کام نہیں چلا۔ علامہ (فضل حق) نئے نئے گئے تھے۔ ایک ہی سال گذرا تھا۔ ان کو وہ کتاب دی اور کہا کہ مولانا! آپ اس کو درست کردیں۔ چنانچہ علامہ نے اس کی عبارت درست کی اور معلومات میں بہت کچھ اضافہ کردیا۔ اور حاشیہ میں کثیر التعداد کتب کے حوالے لکھے۔

جب یہ کتاب مولوی صاحب سپرنٹینڈینٹ کے پاس لے گئے تو وہ اسے دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا۔ اور اس نے کہا مولوی صاحب! تم بڑا لائق آدمی ہے مگر جن کتابوں کے حوالے دیے ہیں اور ان کی عبارتیں نقل کی ہیں یہ کہاں ہیں؟

مولوی صاحب مسکرائے اور اصل واقعہ علامہ کا کہہ سنایا۔ وہ اسی وقت مولوی صاحب کو لے کر بیرک میں آیا۔ علامہ تھے نہیں۔ کچھ انتظار کے بعد دیکھا کہ ٹوکرا بغل میں دبائے چلے آرہے ہیں۔ وہ یہ دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر لایا اور معذرت کی اور کلرکی میں لے لیا اور گورنمنٹ میں ان کی سفارش کی۔

ادھر علامہ کے صاحبزادے مولوی شمس الحق دہلوی اور علامہ کے قریبی عزیز خان بہادر مفتی انعام اللہ گوپاموی کے داماد منشی خواجہ غلام غوث بے خبر و خان بہادر ذوالقدر میر منشی لفٹننٹ مغربی و شمالی صوبہ اودھ سرگرم سعی تھے۔ پروانۂ آزادی حاصل کیا اور مولوی شمس الحق انڈمان روانہ ہوگئے۔

وہاں (بحری) جہاز سے اترے۔ شہر میں گئے تو ایک جنازہ پر نظر پڑی۔ اس کے ساتھ بڑا ازدحام تھا۔ انھوں نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ کل ۱۲ر صفر المظفر ۱۲۷۸ھ کو علامہ کا انتقال ہوگیا۔ اب سپردِ خاک کرنے جارہے ہیں۔ یہ بھی ہمراہ ہوگئے اور بعدِ دفن و فاتحہ بصد حسرت و یاس لوٹے۔ (ص ۳۹ و ۴۰۔ غدر کے چند علما از مفتی انتظام اللہ شہابی)

مولانا عبدالحق خیرآبادی فرزند علامہ فضل حق خیرآبادی کے بارے میں مولانا عبدالشاہد شیروانی لکھتے ہیں:

''مولانا نے آخر وصیت بھی فرمائی کہ جب انگریز ہندوستان سے چلے جائیں تو میری قبر پر خبر کردی جائے۔ چنانچہ ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو رفیق محترم مولوی سید نجم الحسن صاحب رضوی خیرآبادی نے مولانا (عبدالحق) کے مدفن (درگاہ مخدومیہ خیرآباد ضلع سیتاپور، اودھ) پر ایک جمِ غفیر کے ساتھ حاضر ہوکر میلاد شریف کے بعد قبر پر فاتحہ خوانی کی۔ اور اس طرح پورے پچاس سال کے بعد انگریزی سلطنت کے خاتمہ کی خبر سنا کر وصیت پوری کی۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء"۔ (ص ۱۲۔ مقدمہ زبدۃ الحکمۃ از عبدالشاہد شیروانی۔ مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۴۹ء)

☆☆☆☆☆

ہندوستان میں انگریزوں کی تجارت وحکومت

۱۶۰۰ء کے آخر میں ملکہ الزبتھ نے لندن کی ایک تجارتی کمپنی کو بعہد بادشاہِ ہند جلال الدین محمد اکبر (متوفی ۱۴ر جمادی الآخرہ ۱۰۱۴ھ/ ۱۷ر اکتوبر ۱۶۰۶ء درآگرہ) ہندوستان میں تجارت کرنے کی باضابطہ منظوری دی۔ پرتگیزی اور ڈچ یہاں پہلے سے تجارت کیا کرتے تھے جنھوں نے انگریزوں کی مزاحمت ومخالفت کی مگر انگریز رفتہ رفتہ ان پر غالب آگئے۔

۱۶۰۸ء میں انگریزوں نے سورت (گجرات) میں سب سے پہلے ایک تجارتی کوٹھی بنا کر وہاں سے اپنا کام شروع کیا۔ مغل بادشاہ نورالدین جہانگیر نے ۱۶۱۳ء میں سورت، کھمبات، گوا اور احمد آباد میں انگریزوں کو اپنی تجارتی کوٹھیاں بنانے کا پروانہ دیا۔ آزاد تجارت کی دولت عہدِ جہانگیر ہی میں انگریزوں کو حاصل ہوگئی۔

۱۶۱۵ء میں جیمس اول بادشاہ انگلستان نے جہانگیر بادشاہ دہلی کی طلب پر سرٹامس رُو کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا جو چار سال تک یہاں مقیم رہا۔ کپتان ولیم ہاکنز تاجر ایسٹ انڈیا کمپنی سرٹامس سے پہلے ہندوستان میں موجود تھا جو بادشاہ دلی کا ہمنشین بن چکا تھا۔ جہانگیر بائیس سال تک ہندوستان پر حکومت کر کے ۸ر صفر ۱۰۳۷ھ/ ۲۸ر اکتوبر ۱۶۲۷ء کو کشمیر سے لاہور جاتے ہوئے راستے میں انتقال کر گیا۔ شاہدرہ لاہور میں اس کی تدفین ہوئی۔ جہانگیر کے عہد میں انگریزوں کو ہندوستان کے اندر آزاد تجارت کے وسیع مواقع حاصل ہوئے۔

شاہجہاں کے عہد میں انگریزوں کے تجارتی ادارہ ’’ایسٹ انڈیا کمپنی‘‘ نے مشرقی ساحل مدراس پر ایک وسیع وعریض زمین خرید کر فورٹ سینٹ جارج کی تعمیر کی۔ اور کلکتہ کے قریب دریائے گنگا کے دہانے پر واقع مقام ہگلی میں بھی ایک تجارتی کوٹھی بنالی۔ شاہجہاں نے ۱۶۲۸ء سے ۱۶۵۸ تک ہندوستان پر حکومت کی۔ ۲۶ر رجب ۱۰۷۶ھ/ یکم فروری ۱۶۶۶ء میں اکبر آباد (آگرہ) میں اس کا انتقال ہوا۔ وہیں تاج محل کے اندر اس کی تدفین ہوئی۔

اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے معتمد اور مہم جو جنرل میر جملہ کے انتقال (۱۶۶۳ء) کے بعد نواب شائستہ خاں کو میر جملہ کی جگہ بنگال بھیجا جس نے تیس برس تک وہاں حکومت کی۔

مولوی بشیر الدین دہلوی اس شائستہ خاں کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''یہ وہی شائستہ خاں ہے جس نے ۱۶۸۶ء میں انگریز تاجروں کو اپنے علاقہ سے بدر کر دیا تھا اور اس سے پہلے بھی ۱۶۶۰ء میں اسی نے پرتگیزوں اور دوسرے بحری قزاقوں کو جو چٹا گانگ کے اطراف کثرت سے بھرے ہوئے تھے صاف کر دیا تھا۔ (ص ۵۰۱، واقعات دارالحکومت دہلی، حصہ اول، ۱۳۳۷ھ/ ۱۹۱۹ء۔ از مولوی بشیر الدین دہلوی۔ طبع سوم اردو اکاڈمی دہلی ۱۹۹۵ء)

ہندوستان کے شرقی کنارے پر سب سے پہلے انگریزوں کی تجارتی کوٹھی ۱۶۲۵ء میں امر گاؤں ضلع نلور، مچھلی پٹن ضلع کرشنا میں بنی۔ اور چند سال کے بعد ۱۶۳۳ء میں بالاسور اور دوسرے غیر معروف مقامات ہری ہر پور (اڑیسہ) میں بنیں۔

۱۶۵۱ء میں ایک کوٹھی ہگلی (بنگال) میں بصلۂ حسنِ خدماتِ طبی ڈاکٹر گیبریل ہوٹن کے بنی، جس نے صوبہ دار بنگال کے گھر میں بڑے معرکے کا علاج کیا تھا۔

چارناک نے جو ہگلی کی کوٹھی کا صدر تھا ۱۶۸۶ء میں کلکتہ میں ایک اور شاخ کھولنی چاہی لیکن نواب شائستہ خاں کی دشمنی کی وجہ سے وہاں سے اسے بھاگنا پڑا اور مدراس میں جا کر پناہ لی۔ ۱۶۹۰ء میں اورنگ زیب سے فرمان حاصل کر کے ایک چھوٹی سی کوٹھی قائم کی گئی جو بڑھتے بڑھتے آج کلکتہ جیسا مشہور مقام ہو گیا جو برٹش انڈیا میں درجۂ دوم کا شہر ہے۔ شائستہ خاں ۱۶۶۳ء میں دکن سے بنگال لایا گیا جس نے ۱۶۹۴ء میں اکیانوے سال کی عمر میں اور بہ حساب قمری ترانوے سال کی عمر میں آگرہ میں انتقال کیا۔ (ص ۵۰۱۔ حاشیہ واقعات دارالحکومت دہلی حصہ اول)

اورنگ زیب کے عہد میں ۱۶۶۱ء میں چارلس کو ایسٹ انڈیا کمپنی کا چارٹر ملا اور بمبئی پرتگیزیوں کے حوالے کی گئی۔ ۱۶۶۴ء میں فرانسیسوں نے باضابطہ ہندوستانی کمپنی کی بنیاد رکھی۔ جارج چارناک نے ۱۶۹۰ء میں کلکتہ کی بنیاد ڈالی۔ ۱۷۰۲ء میں ''یونائیٹیڈ ایسٹ انڈیا کمپنی'' کی تشکیل ہوئی۔

اورنگ زیب عالمگیر نے مئی ۱۶۵۹ء سے ۱۷۰۷ء تک ہندوستان پر حکومت کی۔ احمد نگر میں بروز جمعہ بتاریخ ۲۸/ ذوالقعدہ ۱۱۱۷ھ/ ۴؍ مارچ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کا انتقال ہوا۔ خلد آباد

متصل دولت آباد ضلع اورنگ آباد دکن (موجودہ مہاراشٹر) میں تدفین ہوئی۔

محمد معظم معروف بہ شاہ عالم بہادر شاہ فرزند اورنگ زیب کے عہد حکومت از ۱۷۰۷ء تا ۱۷۱۲ء و جہاں دار شاہ فرزند شاہ عالم بہادر شاہ کے عہد حکومت از ۱۷۱۲ء تا ۱۷۱۳ء کے بعد جہاں دار شاہ کے برادر زادہ فرخ سیر کے عہد ۱۷۱۳ء تا ۱۷۱۹ء کا ایک اہم واقعہ اس سلسلے میں قابل ذکر ہے کہ:

۱۷۱۶ء میں بادشاہ بیمار رہا۔ علاج کے لئے اسکاٹ لینڈ کا ایک ڈاکٹر ہیملٹن گیبریل طلب کیا گیا جس کے علاج سے صحت کامل ہوگئی۔

بادشاہ نے اپنی صحت کی خوشی میں ڈاکٹر سے کہا کہ مانگو کیا مانگتے ہو؟ ڈاکٹر نرا ڈاکٹر ہی نہ تھا بلکہ اپنی قوم کا فدائی تھا۔ اس نے منفعتِ ذاتی پر قومی بہتری کو ترجیح دی اور عرض کیا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی سے جو محصول در لیا جاتا ہے اس کی معافی کا فرمان عطوفت نشان مرحمت فرمایا جائے اور اس کے معاوضے میں کوئی سالانہ رقم یکمشت مقرر ہو۔

جس کا مطلب یہ تھا کہ اس کمپنی کے حقوق تسلیم کر لیے جائیں۔ اس مراعات نے کمپنی کے پاؤں جما دیے۔ (ص ۶۲۷۔ واقعات دار الحکومت دہلی حصہ اول از مولوی بشیر الدین دہلوی)

شاہ عالم بہادر شاہ کے پوتے محمد شاہ رنگیلے کی مدت حکومت اکتوبر ۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۸ء مغلیہ حکومت کی کمزوری وابتری و ذلت و رسوائی سے بھرپور اور ایک عبرت ناک حکومت تھی۔ یہاں تک کہ ابو المظفر جلال الدین سلطان عالی گوہر معروف بہ شاہ عالم ثانی (مدت حکومت ۱۷۵۹ء تا ۱۸۰۶ء) تک مغلیہ حکومت اتنی کمزور و ناتواں ہوگئی کہ بادشاہ بننے کے باوجود شاہ عالم ثانی کو دس سال الٰہ آباد میں گذارنے پڑے اور چھبیس لاکھ سالانہ اسے ایسٹ انڈیا کمپنی سے ملنا شروع ہوا جس پر اسے قناعت کرنا پڑا۔ دس سال بعد شاہ عالم ثانی کو دلی آنا نصیب ہوا۔ ریاستوں نے جابجا بغاوت کرکے مغل شہنشاہیت کے ٹکڑے کر ڈالے اور ہندوستان کے ہر حصے میں خود مختار ریاستیں قائم ہوگئیں۔

ایک طرف نادر شاہ درانی نے ۱۷۳۸ء میں دلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور تخت طاؤس کے ساتھ کروڑوں روپے ہندوستان سے لے گیا۔ ہزاروں انسانوں کا قتل عام کیا اور ہزاروں مکانات تباہ کر دیے۔ دوسری طرف احمد شاہ ابدالی ۱۷۴۸ء میں آدھمکا۔ پھر ۱۷۴۹ء میں بھی ہندوستان پر چڑھ دوڑا۔ اس طرح درانی اور ابدالی نے مغل حکمرانوں کی قوت اور شوکت وحشمت کو

خاک میں ملادیا۔ تیسری مرتبہ ۱۷۵۷ء میں پھر احمد شاہ ابدالی نے دلی پر قبضہ کرلیا اور دو ماہ تک یہاں رہا۔ چوتھی بار ۱۷۵۹ء میں ابدالی نے دلی کو تاراج کیا۔ دوسری طرف جاٹ اور مرہٹے کچھ دنوں بعد دہلی میں گھس آئے اور یہاں لوٹ مار کی انتہا کردی لیکن جب پھر احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر چڑھائی کی تو جنوری ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے میدان میں اس نے مرہٹوں کو ڈھیر کردیا اور ان کی طاقت وقوت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کردیا۔ تیسری جانب انگریز اپنا تجارتی لباس اتار کر فاتح اور حاکم بننے کے لئے کمر بستہ ہوگئے اور جگہ جگہ اپنی عیارانہ وشاطرانہ حکمت عملی کے تحت مداخلت و جارحیت کے راستے ڈھونڈنے لگے۔ دہلی کی طرف انگریزوں نے بعد میں رخ کیا وہ پہلے ریاستی وصوبائی مورچوں کو فتح کرنے اور انھیں مضبوط کرنے میں ایک مدت تک لگے رہے۔

۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی، ۱۷۶۴ء میں جنگ بکسر، ۱۷۷۴ء میں جنگ روہیل کھنڈ، اس کے بعد حیدر علی سے کئی جنگیں کرنے کے بعد آخر میں ۱۷۹۹ء میں اس کے شیر دل بیٹے سلطان ٹیپو کو زیر کر کے ہی انگریزوں نے دہلی کی طرف قدم بڑھائے۔ ۱۸۰۱ء میں اودھ اور ۱۸۰۳ء میں دہلی پر انگریز حاوی اور مسلط ہوگئے لیکن اپنی حکمت عملی کے تحت اودھ کی نوابی اور دہلی کی شاہی حکومت کو باقی و برقرار رکھا جن کی حیثیت وظیفہ خوار حکومت سے زیادہ نہ تھی۔ اور آخر میں ۱۸۵۶ء میں اودھ اور ۱۸۵۷ء میں دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کو تحلیل کر کے ۱۸۵۸ء میں پورا ہندوستان شاہ انگلستان کے حوالے کردیا گیا اور ملکہ الزبتھ کی براہِ راست حکومت سارے ہندوستان پر ہوگئی۔ اودھ کے آخری نواب واجد علی شاہ کو گرفتار کر کے مع اہل وعیال کلکتہ اور دہلی کے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کر کے باقی ماندہ اہل وعیال کے ساتھ رنگون بھیج دیا گیا جہاں انھوں نے حسرت ویاس کے ساتھ اپنی زندگی کے ایام پورے کیے۔ ۱۸۶۲ء میں بہادر شاہ ظفر کا انتقال ہوا۔

انگریزوں کی شاطرانہ چالیں اور ان کی ریشہ دوانیاں ہرگز کامیاب نہ ہوسکتی تھیں اگر انھیں ہندوستانی حریصوں اور غداروں کی فوج نہ مل جاتی۔ جنگ پلاسی (بنگال) میں نواب سراج الدولہ کو میر جعفر اور جنگ سرنگا پٹم (میسور) میں سلطان ٹیپو کو میر صادق اگر دھوکہ نہ دیتے تو اتنی آسانی کے ساتھ انگریز میدان نہ جیت لیتے اور اپنی فتح وکامرانی کے پرچم نہیں لہرا سکتے تھے۔ اسی حقیقت کا شاعر مشرق ڈاکٹر اقبال نے اپنے اس شعر میں اظہار کیا ہے:

جعفر از بنگال و صادق از دکن

تنگِ آدم، تنگِ دیں، تنگِ وطن

دہلی میں مرزا الٰہی بخش و مرزا مغل و منشی رجب علی و حکیم احسان اللہ خاں اگر انگریزوں کے آلۂ کار اور ان کے حامی و طرف دار نہ بن جاتے تو آغاز انقلاب ۱۸۵۷ء کے چند ماہ کے اندر انگریز دہلی فتح نہ کر پاتے۔

یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ بہادر شاہ ظفر کی ضعیفی و کبرسنی نے بھی دہلی کا مورچہ مضبوط نہ ہونے دیا۔ ۱۸۳۷ء سے ۱۸۵۷ء تک اس نے سالانہ ایک لاکھ روپے کے وظیفہ خوار بادشاہ کی حیثیت سے اپنی زندگی گذاری اور جواں مردی و اولعزمی کی کوئی تاریخ رقم کرنے میں وہ تاحیات ناکام رہا۔ دیگر شہزادگانِ آل تیمور بھی عیش و عشرت سے آگے عموماً کچھ نہیں جانتے تھے اور طاؤس و رباب کے جھرمٹ میں ان کی زندگی اس طرح گذر رہی تھی کہ شمشیر و سنان کو انھوں نے گویا کبھی ہاتھ نہ لگایا جو ان کے آبا و اجداد کا طرۂ امتیاز تھا۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا اور دوسروں کی شکوہ سنجی سے بہتر یہی ہے کہ ضعف و اضمحلال کے شکار اور دوں ہمتی کے خوگر لوگوں کے انجام سے آنے والی نسل کو درس عبرت لینا چاہیے کہ اس کے سوا ان کے حق میں کوئی بات مفید اور مستقبل کے لئے محرک و نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ:

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

انگریزوں نے بادشاہوں، نوابوں، راجاؤں، تعلقہ داروں، زمینداروں کی کمزوریوں اور ان کے اختلافات کا فائدہ اٹھایا۔ پہلے تاجر کی حیثیت سے انھوں نے کسانوں، زمینداروں، صنعت کاروں، پارچہ بافوں، ہنرمندوں کا خون چوسا اس کے بعد تر و تازہ ہو کر صوبائی حکومتوں اور ریاستوں کو یکے بعد دیگرے نگلنا شروع کیا۔ انھیں ایک دوسرے سے لڑا کر اور پھر اپنے طاقتور ہاتھوں سے ان کا گلا گھونٹ کر اپنے اختیار و اقتدار کی بنیادیں مضبوط کرتے رہنے کا انھوں نے سلسلہ جاری کیا اور آخر میں ۲۰ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو وہ دہلی کے لال قلعہ پر اپنا پرچم لہرانے، فاتح ہندوستان بننے اور بلا شرکتِ غیرے حاکم ہندوستان بننے میں بھی وہ کامیاب ہو گئے۔ یہاں اس مرحلے میں بھی انگریزوں کو لعنت ملامت کرنے اور انھیں کوسنے سے بہتر یہی ہے کہ ہندوستانی عوام کو یہی پیغام دیا جائے کہ:

گل و گُل چیں کا گِلہ بلبلِ خوش رنگ نہ کر
تو گرفتار ہوئی اپنی صدا کے باعث

☆☆☆☆☆

جناب وقار الحسن صدیقی سابق ڈائرکٹر آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا و سابق اوایس ڈی رضا لائبریری رام پور، یوپی (انڈیا) ص ۱۴۔ پیش لفظ ''تاریخ جنگِ آزادیِ ہند ۱۸۵۷ء مؤلفہ سید خورشید مصطفیٰ رضوی، مطبوعہ رضا لائبریری رام پور، یوپی۔ طبع اول ۱۴۲۱ھ/ ۲۰۰۰ء کے اندر یہ تاریخی ریکارڈ درج کرتے ہیں کہ:

''انگریزوں کے جاسوس گوری شنکر نے ۲۸؍اگست ۱۸۵۷ء کی رپورٹ میں لکھا ہے کہ:

مولوی فضلِ حق جب سے دہلی آیا ہے، شہریوں اور فوج کو انگریزوں کے خلاف اُکسانے میں مصروف ہے۔

وہ کہتا پھرتا ہے کہ اس نے آگرہ گزٹ میں برطانوی پارلیمنٹ کا ایک اعلان پڑھا ہے جس میں انگریزی فوج کو دہلی کے تمام باشندوں کو قتل کر دینے اور پورے شہر کو مسمار کر دینے کے لئے کہا گیا ہے۔ آنے والی نسلوں کو یہ بتانے کے لئے کہ یہاں دہلی کا شہر آباد تھا، شاہی مسجد کا صرف ایک مینار باقی چھوڑا جائے گا۔''

(INDIAN OFFICE LONDON.MUTINY NO. 170, PP.442-443)

انگریزوں کے لرزہ خیز مظالم

تقریباً ۱۹۲۵ء میں مسٹر ایڈورڈ ٹامسن کی ایک کتاب شائع ہوئی جس کا نام ہے The other side of the Medal یعنی ''تصویر کا دوسرا رخ''۔اس کتاب کا اردو ترجمہ شیخ حسام الدین میونسپل کمشنر امرت سر پنجاب نے تقریباً ۱۹۳۰ء میں کیا۔ اردو اکیڈمی لاہور کا دوسرا ایڈیشن فروری ۱۹۴۷ء میں منظر عام پر آیا جو اس وقت راقم کے پیش نظر ہے۔

''تصویر کا دوسرا رخ'' لکھ کر مسٹر ایڈورڈ ٹامسن نے اس وقت یہ کوشش کی تھی کہ ہندوستانیوں اور انگریزوں کی باہمی منافرت دور کی جائے تا کہ ان کے درمیان اعتماد کی ایک ایسی فضا اور ایسا ماحول بن جائے جس سے تحریک آزادی کے خطرات کا سدباب کیا جا سکے۔

زیر نظر حصے میں مذکورہ کتاب کے کچھ اقتباسات بلا تبصرہ نقل کیے جا رہے ہیں۔ یہ اقتباسات انگریزی مظالم اور انقلاب ۱۸۵۷ء میں ہونے والے مظالم کی داستان اپنے آپ بیان کرتے چلے جائیں گے۔

مسٹر نکلسن (Nicholson) اپنے ایک خط بنام مسٹر ایڈورڈز (Edwards) میں لکھتا ہے:

''دہلی میں انگریز عورتوں اور بچوں کے قاتلوں کے خلاف ہمیں ایک ایسا قانون پاس کرنا چاہیے جس کی رُو سے ہم ان کو زندہ ہی جلا سکیں یا زندہ ان کی کھال اتار سکیں یا گرم سلاخوں سے اذیت دے کر ان کو فنا کے گھاٹ اتار سکیں۔

ایسے ظالموں کو محض پھانسی کی سزا سے ہلاک کر دینے کا خیال ہی مجھے دیوانہ کیے دیتا ہے۔ میری یہ دلی خواہش ہے کہ کاش میں دنیا کے کسی ایسے گمنام گوشے میں چلا جاؤں جہاں مجھے یہ حق حاصل ہو کہ میں حسب ضرورت سنگین انتقام لے کر دل کی بھڑاس نکال سکوں۔

Kaye, Book VI. ch.1 (ص ۶۱۔ تصویر کا دوسرا رخ)

ایک پادری کی بیوہ ہندوستانیوں کو دی جانے والی وحشت ناک اذیت سے لطف اندوزی کی تصویر اس طرح پیش کرتی ہے۔

’’لڑائی کے اختتام پر بہت سے قیدیوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا۔ اور یہ معلوم کرنے پر کہ اس قسم کی موت کی وہ کوئی خاص پروانہیں کرتے ان میں سے چار آدمیوں کو فوجی عدالت کے حکم سے توپوں سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔

چنانچہ ایک روز ایک توپ کے بہت بڑے دھماکے کی آواز سے ہم چونک پڑے۔ جس کے ساتھ ہی ایک ناقابلِ بیان دھیمی مگر وحشتناک چیخ بھی سنائی دی۔ دریافت کرنے پر ایک افسر نے ہمیں بتایا کہ یہ ایک نہایت ہی کرب انگیز نظارہ تھا۔ یعنی ایک توپ میں اتفاق سے بارود زیادہ بھرا ہوا تھا جس کے چلائے جانے سے بدقسمت ملزم کا گوشت ریزہ ریزہ ہو کر فضائے آسمانی میں اڑا اور تماشائیوں پر خون کے چھینٹے اور گوشت کے ٹکڑے گرے۔ اور اس کا سر ایک راہ رو پر اس زور سے گرا کہ اس کو بھی چوٹ آئی۔ (Mis Coop Land alady's ascape from gewaliar.P.233) (ص ۵۸۔ تصویر کا دوسرا رخ)

آئرلینڈ کا ایک جرنلسٹ مسٹر ڈی لین (Delean) ایڈیٹر ٹائمز آف انڈیا اپنے ایک آرٹیکل میں لکھتا ہے۔

’’زندہ مسلمانوں کو سور کی کھال میں سینا یا پھانسی سے پہلے ان کے جسم پر سور کی چربی ملنا یا زندہ آگ میں جلانا یا ہندوستانیوں کو مجبور کرنا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بدفعلی کریں۔ ایسی مکروہ اور منتقمانہ حرکات کی دنیا کی کوئی بھی تہذیب کبھی اجازت نہیں دیتی۔ ہماری گردنیں شرم و ندامت سے جھک جاتی ہیں اور یقیناً ایسی حرکات عیسائیت کے نام پر ایک بدنما دھبہ ہیں۔ جن کا کفارہ لازمی طور پر ہمیں بھی ایک دن ادا کرنا پڑے گا۔

اس قسم کی دردناک جسمانی اور دماغی سزائیں دینے کا ہمیں مطلقاً کوئی حق نہیں اور نہ ہی ہم یورپ میں ایسی سزائیں دینے کی جرأت کر سکتے ہیں۔ (Russel, Diary, II,P.43(May 1858) (ص ۶۹۔ تصویر کا دوسرا رخ)

ایک پادری کی بیوی نہایت فاتحانہ انداز میں لکھتی ہے:

’’جب بہت سے باغی گرفتار کر کے لائے گئے تو انھیں حکم دیا گیا کہ وہ گرجا کے فرش کو صاف کریں۔ مگر باوجودیکہ یہ لوگ اس قسم کا کام اپنے مذہبی معتقدات کے خلاف سمجھتے تھے پھر بھی سنگین کی نوک سے انھیں اس حقیر کام کے کرنے پر مجبور کیا گیا۔ ان میں سے بعض آدمیوں نے نہایت

پھرتی سے اس کام کو سرانجام دیا محض اس خیال سے کہ شاید پھانسی کی سزا سے بچ جائیں گے لیکن بے سود۔ کیوں کہ وہ سب کے سب پھانسی پر لٹکا دیے گئے۔ (Alady's Escape from gawaliar, P.243). (۴۷ تصویر کا دوسرا رخ)

جنرل نیل (Neill) نے کان پور میں مامور میجر ریناڈ (Renaud) کو یہ ہدایت دی:

"بعض دیہات کو ان کی مجرمانہ حرکات کی بنا پر عام تباہی کے لئے منتخب کر دیا گیا ہے جہاں کی تمام مرد آبادی کو قتل کر دینا ہوگا۔ باغی رجمنٹوں کے تمام ایسے سپاہی فی الفور پھانسی پر لٹکا دیے جائیں جو اپنے چال چلن کے متعلق اطمینان بخش ثبوت بہم نہ پہنچا سکیں۔

قصبہ فتح پور کی تمام آبادی کو محاصرہ میں لے کر تہِ تیغ کر دیا جائے کیوں کہ اس قصبہ نے بغاوت میں حصہ لیا ہے۔ باغیوں کے تمام سرغنوں بالخصوص فتح پور کے تمام سرغنوں کو فی الفور پھانسی دے دی جائے۔ اور ان کے سر کاٹ کر وہاں کی بڑی عمارت پر لٹکا دیے جائیں۔ Kaye, Book V chepter.ii۔(ص ۷۵۔ تصویر کا دوسرا رخ)

"جب تقریباً ڈیڑھ سو باغیوں کو اس طرح گولیوں سے اڑا دیا گیا تو قتل کرنے والوں میں سے ایک شخص غش کھا کر گر پڑا جو ہلاک کرنے والوں میں سے سب سے بوڑھا سپاہی تھا اس لئے آرام کرنے کے لئے تھوڑا وقفہ دیا گیا۔ چنانچہ اس کے بعد قتل کی کارروائی کو دوبارہ شروع کیا گیا اور جب تعداد دو سو سینتیس (237) تک پہنچ گئی تو ایک افسر نے اطلاع دی کہ باقی باغی بُرج سے باہر آنے سے انکار کرتے ہیں جہاں کہ وہ چند گھنٹے عارضی طور پر پہلے سے بند کر دیے گئے تھے۔ اس پر بُرج کے دروازے کھولے گئے تو معاً ایک نہایت ہی دردناک منظر دیکھنے میں آیا۔ جس سے ہالوں کے بلیک ہول Holwell's Black Hole کی تلخ یاد دوبارہ تازہ ہوگئی۔

یعنی پینتالیس انسانوں کی مردہ لاشیں باہر لائی گئیں جو خوف، گرمی، سفر کی صعوبت اور دم گھٹنے کی وجہ سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ہلاک ہوگئے تھے۔ (ص ۹۰ و ۹۱۔ تصویر کا دوسرا رخ)

محاصرہ میں لیے گئے ہندوستانیوں کی نگرانی پر مامور سول کمشنر مسٹر گریتھ (Greathed) لکھتا ہے۔

''دو انگریزوں کے قتل کے عوض پانچ سو باغیوں کی جان لینا ایک ایسا خوفناک بدلہ ہے جو کبھی فراموش نہ ہو سکے گا۔(ص ۹۷۔تصویر کا دوسرا رخ)

''ایک افسر جو ریناڈ (Renaud) کے دستے کے ساتھ متعین تھا بتلاتا ہے کہ ہندوستانیوں کو اس کثرت کے ساتھ پھانسی پر لٹکایا گیا جو بیان سے باہر ہے۔ دو دن کے اندر بیالیس (42) آدمیوں کو سڑک کے کنارے پر پھانسی دی گئی اور بارہ (12) آدمیوں کو تو صرف اس جرم پر پھانسی کی سزا ملی کہ جب فوج مارچ کرتی ہوئی ان کے سامنے سے گذری تو ان کے چہرے دوسری طرف کیوں تھے؟ جہاں جہاں فوج نے پڑاؤ کیے وہاں پر قرب وجوار کے تمام دیہات جلے ہوئے تھے۔ Russel, Dairy.P.221,222۔(ص ۹۸۔ تصویر کا دوسرا رخ)

''ایک طرف تو فوجی قانون کے نفاذ کا اعلان کر دیا گیا اور دوسری طرف مجلس وضعِ آئین و قوانین نے مئی اور جون میں نہایت خوفناک قوانین پاس کیے جن پر پوری سرگرمی سے عمل کیا گیا اور فوجیوں اور سول افسران نے خونیں عدالتیں قائم کر کے ہندوستانیوں کو بے دریغ موت کے گھاٹ اتارنا شروع کر دیا بلکہ بعض حالات میں تو بغیر نام نہاد عدالت کے حکم سے بھی پھانسیاں دی گئیں۔جن میں مرد و عورت کی کوئی تمیز روا نہ رکھی گئی۔

بایں ہمہ خوں ریزی کی آگ دن بہ دن اور بھڑکتی گئی چنانچہ آج بھی پارلیمنٹ کے محفوظ ریکارڈ میں گورنمنٹ ہند کی وہ تمام یادداشتیں محفوظ ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ باغیوں کے علاوہ عام آبادی میں سے عورتوں، مردوں، بچوں اور بوڑھوں تک کو بھی پھانسی کے تختوں پر لٹکایا گیا۔ نہ صرف سولی پر اکتفا کیا گیا بلکہ دیہات میں ان کو اپنے مکانوں میں بند کر کے آگ میں جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔اور شاذ و نادر ہی کسی ایک کو گولی سے مارنے کی تکلیف کی گئی ہو۔

انگریزوں نے نہ صرف اس قسم کی خوفناک سزاؤں کا فخریہ اظہار کیا بلکہ خود اپنی یادداشتوں میں ان دردناک واقعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہم نے حتی الامکان کسی ذی روح آبادی کو زندہ نہیں رہنے دیا۔ یہاں تک کہ ان سیاہ فام انسانوں کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے نظاروں سے اپنی خوں آشامی کی پیاس بجھا کر لطف اندوز ہوتے رہے ہیں۔ Kaye, Book v, Chepter.ii (ص ۱۰۳ و ۱۰۴۔تصویر کا دوسرا رخ)

''ایک موقع پر چند نوجوان لڑکوں کو محض اس بنا پر پھانسی کی سزا دی گئی کہ انھوں نے غالباً تفننِ طبع کے طور پر باغیوں کی جھنڈیاں اٹھائے ہوئے بازاروں میں منادی کرادی تھی۔ سزائے موت دینے والی عدالت کے ایک افسر نے پُرنم آنکھوں سے کمانڈنگ افسر کے پاس جا کر درخواست کی کہ ان نابالغ مجرموں پر رحم کر کے پھانسی کی سزا کو تبدیل کر دیا جائے۔ لیکن بے سود۔

اس تمام سلسلے میں بے شمار ایسے واقعات ملیں گے جن میں اس قسم کی نمائشی عدالتوں سے بھی گریز کیا گیا اور بے گناہ انسانوں کو بے دریغ قتل کیا گیا۔

پھانسیاں دینے کے لئے رضا کارانہ ٹولیاں بنائی گئیں جنھوں نے اس مقصد کی تکمیل کے لئے دیہات میں دورہ کیا۔ اس حالت میں کہ ان کے ساتھ پھانسی دینے کا سامان بھی مکمل نہ تھا اور نہ ہی کسی کو پھانسی دینے کے طریقہ سے پوری واقفیت تھی۔ چنانچہ ان میں سے ایک ''شریف آدمی'' اپنی شاندار کامیابیوں کا اس طرح فخریہ اظہار کرتا تھا کہ ہم پھانسی دیتے وقت عام طور پر آم کے درخت اور ہاتھی کو استعمال کرتے تھے۔

یعنی ملزم کو ہاتھی پر بٹھا کر درخت کے نیچے لے جاتے تھے اور اوپر سے رسّہ ڈال کر ہاتھی کو ہنکایا جاتا تھا یہاں تک کہ ملزم اس طرح تڑپنے اور جاں کنی کی حالت میں اکثر اوقات انگریزی کے آٹھ (8) ہندسے کی دل چسپ شکل بن کر رہ جاتا تھا۔ Kaye, Book v, Chepter. ii (۱۰۴ و ۱۰۵۔ تصویر کا دوسرا رخ)

''تمام جج صاحبان رحم کے اظہار کی پالیسی کے خلاف ہیں۔ چنانچہ تمام ایسے ملزمین جو پیش کیے گئے تقریباً سب کے خلاف فردِ جرم لگادی گئی اور موت کی سزا کا حکم دے دیا گیا۔ شہر کے ایک بلند مقام پر جو ایک چوگوشہ سولی نصب کی گئی ہے جہاں پانچ اور چھ اشخاص کو روزانہ پھانسی دی جاتی ہے جس کے قریب ہی انگریز افسران سگریٹوں کے کش پر کش اڑاتے ہوئے لاشوں کے تڑپنے کے نظاروں میں محو دکھائی دیتے ہیں۔ Holmes. P. 386 (ص۔ ۱۰۸۔ تصویر کا دوسرا رخ)

''ہر ایسے ہندوستانی کو قطع نظر اس کے کہ وہ سپاہی ہے یا اودھ کا دیہاتی، بے دریغ تہِ تیغ کیا گیا۔ یہاں تک کہ نہ تو کوئی سوال ہی کیا جاتا تھا اور نہ ہی کسی قسم کا کوئی تکلف روا رکھا جاتا تھا بلکہ محض سیاہ رنگت ہی اس کے مجرم ہونے کے لئے کافی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ اور ہلاکت کے لئے ایک رسّہ اور درخت کی شاخ کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اگر یہ اشیا مہیا نہ ہوں تو بندوق کی ایک گولی

بے گناہ انسان کے دماغ کو چیرتی ہوئی نکل جاتی تھی اور وہ وہیں ڈھیر ہوجاتا تھا۔
Majerdia P.195,196 (ص۔۱۱۱۔تصویر کا دوسرا رخ)

''ہماری فوج کے شہر میں داخل ہونے پر تمام ایسے لوگ جو شہر کی چہار دیواری کے اندر چلتے پھرتے نظر آئے سنگینوں سے وہیں پر ختم کردیے گئے۔ایسے بدقسمت انسانوں کی تعداد بہت کافی تھی۔

آپ اس ایک واقعہ سے بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک گھر میں چالیس یا پچاس ایسے اشخاص ہمارے خوف سے پناہ گزیں ہوگئے جو اگرچہ باغی نہ تھے بلکہ غریب شہری تھے اور ہمارے عفو و کرم پر تکیہ لگائے ہوئے تھے جن کے متعلق میں خوشی سے یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ وہ سخت مایوس ہوئے کیوں کہ ہم نے اسی جگہ ان کو اپنی سنگینوں سے ڈھیر کردیا۔(ص۱۱۲۔تصویر کا دوسرا رخ)

ٹائمز آف انڈیا کا ایک رپورٹر لکھتا ہے:

> ''میں نے دہلی کے گمنام بازاروں میں سیر کرنا مطلقاً چھوڑ دیا ہے کیوں کہ کل ایک دردناک واقعہ دیکھنے میں آیا جس سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔
>
> جب ایک افسر بیس (20) سپاہی کو لے کر شہر کی گشت کو جانے لگا تو میں بھی ان کے ہمراہ ہولیا اور راستے میں ہم نے چودہ (14) عورتوں کو لاشوں میں لپٹے ہوئے بازار میں پڑا پایا۔جن کے سر دھڑوں سے ان کے خاوندوں نے خود جدا کردیے تھے۔چنانچہ ایک عینی شاہد سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ دردناک حادثہ اس لئے ظہور پذیر ہوا کہ ان مستورات کے خاوندوں کو شبہ تھا کہ انگریز سپاہیوں کے قابو میں آگئیں تو وہ ان کی عصمت دری کریں گے۔اسی لئے بحالتِ موجودہ اپنے ناموس کے تحفظ کا یہی طریقہ مناسب سمجھا گیا جس کے بعد انھوں نے خود بھی خودکشی کرلی۔چنانچہ ہم نے ان کے خاوندوں کی لاشوں کو بھی بعد میں دیکھا۔ Times, Latters, Dated 19.11.57, Mantgumary Martin

(ص ۔۱۱۴۔ تصویر کا دوسرا رخ)

''نادر شاہ کی تاریخی لوٹ اور قتل عام کے بعد جب کہ اس نے چاندنی چوک کی مسجد میں بیٹھ کر غارت گری کا حکم دیا تھا۔ ایسا دردناک نظارہ آج سے پہلے شاہجہاں کے دارالخلافہ نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ Times, 16.11.57 (ص ۱۱۴۔ تصویر کا دوسرا رخ)

''باغیوں کے جرائم کے مقابلہ میں ہزار گنا زیادہ سنگین پاداش باشندگانِ دہلی کو برداشت کرنی پڑی۔ ہزارہا مرد عورت اور بچوں کو بے گناہ خانماں برباد ہو کر جنگلوں اور ویرانوں کی خاک چھاننی پڑی۔ اور جتنا مال واسباب وہ پیچھے چھوڑ گئے ان سے ہمیشہ کے لئے ان کو ہاتھ دھونے پڑے۔ کیوں کہ سپاہیوں نے گھروں کے کونے کھود کر تمام قیمتی اشیا کو قبضہ میں کر لیا اور باقی سامان کو توڑ پھوڑ کر خراب کر دیا جن کو وہ اٹھا کر نہیں لے جا سکتے تھے۔

Holems, P.386 (ص ۱۱۶۔ تصویر کا دوسرا رخ)

''کئی دفعہ ایسی بے کس اور شریف عورتوں کے غول ماتمی قافلوں کی شکل میں دیکھنے میں آئے جن میں سے اکثر بے چاری بچوں کو اٹھا کر مشکل سے چل سکتی تھیں۔ اور بعض کے ساتھ عمر رسیدہ مرد نظر آتے تھے جو چلتے ہوئے ٹھوکریں کھا کھا کر گر پڑتے تھے۔ Greathed, P.285. Letter Datted 18.9.57 ۔(ص ۱۱۶۔ تصویر کا دوسرا رخ)

''ایک انگریز کا خون غصے اور انتقام سے کھولنے لگتا ہے جب وہ کسی ہندوستانی کے ہاتھوں کسی انگریز عورت کے قتل کا واقعہ سنتا ہے۔ لیکن ہندوستانی تاریخ یا افسانوں کو سن کر عام ہندوستانیوں کے جذبات کی کیا کیفیت ہوگی جب وہ ان بے شمار معصوم اور گمنام عورتوں، بچوں، اور مردوں کے بے دریغ قتل کے حالات پڑھتے یا سنتے ہوں گے جو انگریز کے بے پناہ انتقام کا نہایت سفا کی سے شکار بنائے گئے تھے۔

یقیناً جس طرح ہم اپنے ہم قوم افراد کے مقتول ہونے سے چراغ پا ہو جاتے ہیں اسی طرح ہندوستانیوں کے دماغ بھی ایسے واقعات سننے کے بعد ضرور متاثر ہوتے ہوں گے۔ Kaye. Book V Chepter.ii (ص ۱۱۹۔ تصویر کا دوسرا رخ)

''بالخصوص جنرل نیل (Neill) کے حملہ کے وقت جس بے دردی سے قتل عام کیا گیا اس کے درست تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہیں ہوسکتا۔ علاوہ ازیں میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ الہ آباد میں تو بے انتہا انسانوں کو پھانسی کے تختہ پر لٹکایا گیا۔ چنانچہ جب جنرل نیل ان مظالم سے فارغ ہو چکا تو اس نے اپنے ایک میجر کو کان پور روانہ کیا تو اس نے بھی راستے میں نہایت بے باکانہ طریقے سے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ حالاں کہ بظاہر ان کا کوئی قصور بھی نہیں تھا۔

قتل و غارت کی آخری کمی خود جنرل نیل پوری کرتا ہے جب اس کے حکم سے بے گناہ انسانوں کو ایسی شدید تکالیف دے کر جان سے ہلاک کیا گیا کہ ان کے مقابلے میں ہم ہندوستانی سنگ دلی اور بربریت کا ایک بھی واقعہ پیش نہیں کر سکتے۔ Campbell, 1.P.280

(ص ۱۲۱۔ تصویر کا دوسرا رخ)

''دہلی سے باغیوں کے فرار ہو جانے کے بعد انگریز فاتحین نے باشندوں کا قتل عام کیا اور بے ضابطہ انگریزی عدالتوں کے حکم سے ہزاروں شہری پھانسی کے تختے پر لٹکائے گئے۔ حالاں کہ ان کا بغاوت سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ (ص ۱۲۴۔ تصویر کا دوسرا رخ)

مسٹر ایڈورڈ ٹامسن اپنی اس کتاب ''تصویر کا دوسرا رخ'' کے باب دوم میں ''غدر کے اثرات'' کے عنوان سے لکھتا ہے:

''یہاں پر میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگرچہ میں نے مسٹر کوپر (Cooper) کی کتاب سے بعض سنگین واقعات نقل کیے ہیں لیکن میں نے ان سے بھی زیادہ شدید اور رنج دہ واقعات کو پھر بھی چھوڑ دیا ہے۔ غدر کے متعلق تقریباً تمام دستاویزیں زبان حال سے ہماری زیادتیوں کا اعلان کرتی ہیں۔

۱۹۲۳ء میں غدر کے حالات پر دو کتابیں شایع ہوئیں۔ جن میں سے ایک کا نام ہے ''لارڈ رابرٹس کے خطوط'' Latter of Lard Reberts۔ اور دوسری کا نام ہے Miss Sammerville's Wheel Treck۔ ان ہر دو کتب میں ہماری زیادتیاں بالکل عریاں حیثیت سے ظاہر ہوئی ہیں۔ لیکن دوسری کتاب میں تو مس موصوفہ کے چچا جان کے وہ خطوط بھی شامل کیے گئے ہیں جو بے انتہا خوں ریزی کے مظہر ہیں۔

(ص ۱۲۶۔ تصویر کا دوسرا رخ)

’’ حالاں کہ میں نے جنرل نیل (Neill) کے ان کارناموں کو بالکل چھوڑ دیا ہے جو کان پور کے خونیں حاشہ سے بہ درجہا زیادہ سنگین تھے۔ نیز ہوڈسن (Hadson) کی مشہور زمانہ سنگ دلی کی کارروائی کو بھی میں نے نہیں چھیڑا۔ اگر چہ میرے پاس عینی شاہدوں کی دستاویزیں موجود تھیں جن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ بے شمار دیہات کو ایسے وقت میں جلا کر خاکستر کر دیا گیا جب کہ عورتیں، بچے اور بوڑھے گھروں کے اندر موجود تھے۔ لیکن میں نے نہایت رحم دلی کی وجہ سے ان خوفناک واقعات کو اپنی اس کتاب سے علیحدہ رکھا۔ (ص ۱۲۸ و ۱۲۹۔ تصویر کا دوسرا رخ)

یہاں پر میں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نے جتنے واقعات قلم بند کیے ہیں ان میں سے ایک بھی تو کسی ہندوستانی قلم یا زبان سے نکلا ہوا نہیں ہے۔ مزید برآں میں نے شاذ و نادر ہی کوئی ایک فقرہ ’’ وحشت و بربریت کی آماج گاہ ‘‘ یعنی اینگلو انڈین اخبارات یا اس سے کم درجہ پر اپنے ملک کے اخبارات سے نقل کیا ہوگا۔ اس لئے جو کچھ اس وقت انھوں نے کہا یا لکھا وہ ہمارے اسلاف کی طرح اب نابود ہو چکا ہے۔ اور موجودہ زمانہ کے لئے مناسب بھی یہی ہے کہ ان تحریرات کو بھول جائے۔

لیکن بدقسمتی سے یہ تلخ اور رنج دہ واقعات خاموشی سے برداشت نہیں کیے جا سکتے اس لئے کہ ایک پوری قوم کے دماغ اس وقت تک ان کی یاد سے آتش زیر پا ہیں۔ (ص ۱۲۹، ۱۳۰۔ تصویر کا دوسرا رخ)

رونگٹے کھڑے کر دینے والی انگریزی درندگی کی یہ داستانیں بھی ملاحظہ فرمائیں۔

میجر تھامسن (Thamson) نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے:

’’ دہلی کے مسلمانوں کے قتل عام کی منادی کی گئی۔ حالاں کہ ان میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جن کے متعلق ہمیں علم تھا کہ وہ ہماری حکومت کے خواہشمند تھے مگر ہمارے اکثر نوجوان تو محض خون بہانے کی خواہش پوری کرنے کے لئے اپنی ہی فوج کے ہندوستانی اردلیوں اور پوربی گھسیاروں کو گولی سے اڑا دینے کی تمنا کا اعلانیہ طور پر اظہار کر چکے تھے۔ ‘‘

ایک انگریز کمانڈر لارڈ رابرٹس (Lard Roberts) دہلی کی ایک وحشتناک اور

خوفناک منظرکشی کرتے ہوئے بیان کرتا ہے۔

''صبح کی ابتدائی روشنی میں دہلی سے کوچ کا وہ مرحلہ بڑا ہی دردناک تھا۔ لال قلعہ کے لاہوری دروازوں سے نکل کر ہم چاندنی چوک سے گذرے۔ دہلی حقیقۃً شہر خموشاں معلوم ہوتا تھا۔ ہمارے اپنے گھوڑوں کی سموں کی آواز کے سوا کوئی آواز کسی سمت سے نہ آتی تھی۔ ایک بھی زندہ مخلوق ہماری نظر سے نہ گذری۔ ہر طرف نعشیں بکھری پڑی تھیں۔ ہر نعش پر وہ حالت طاری تھی جو موت کی کشمکش نے طاری کردی تھی۔ ہر نعش تجزیہ وتحلیل کے مختلف مراحل میں تھی۔

ہم چپ چاپ چلے جارہے تھے۔ یا سمجھ لیجیے کہ بے ارادہ زیرلب باتیں کررہے تھے تاکہ انسانیت کی ان دردناک باقیات کی استراحت میں خلل نہ پڑے۔ جن مناظر سے ہماری آنکھیں دوچار ہوئیں وہ بڑے ہی رنج افزا تھے۔ کہیں کوئی کتا کسی نعش کا برہنہ عضو بھنبھوڑ رہا ہے کہیں کوئی گدھ ہمارے قریب پہنچنے پر اپنی گھناؤنی غذا چھوڑ کر پھڑ پھڑاتے پروں سے ذرا دور چلا جاتا لیکن اس کا پیٹ اتنا بھر چکا تھا کہ اڑ نہ سکتا تھا۔

اکثر حالتوں میں مرے ہوئے زندہ معلوم ہوتے تھے۔ کسی کے ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے جیسے کسی کو اشارہ کررہا ہو۔

دراصل یہ پورا منظر اس درجہ بھیانک تھا کہ بیان میں نہیں آسکتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہماری طرح گھوڑوں پر بھی خوف طاری تھا اس لئے وہ بھی بدک رہے تھے اور نتھنے پھلا رہے تھے۔ پوری فضا ناقابلِ بیان حد تک بھیانک تھی جو بڑی مضر بیماری اور بدبو سے لبریز تھی۔ (متعدد کتب تاریخ۔ وص ۲۰۲،۲۰۳۔ ۱۸۵۷ء پہلی جنگ آزادی! واقعات وحقائق مؤلفہ میاں محمد شفیع۔ اریب پبلیکیشنز، پٹودی ہاؤس، نئی دہلی۔ ۲۰۰۵ء)

ایک انگریز فوجی افسر ہنری کوٹن (Henry Cotton) بیان کرتا ہے کہ:

''دہلی دروازہ سے پشاور تک گرینڈ ٹرنک روڈ کے دونوں ہی جانب شاید ہی کوئی خوش قسمت درخت ہوگا جس پر انقلاب ۱۸۵۷ء کے ردعمل اور اسے کچلنے کے لئے ہم نے ایک یا دو عالم دین کو پھانسی پر نہ لٹکایا ہو۔ ایک اندازہ کے مطابق تقریباً بائیس ہزار علما کو پھانسی دی گئی۔''

''مسلمان مجاہدین' کے نام سے لکھی گئی اپنی کتاب میں ایک غیر مسلم مؤرخ

لکھتا ہے:

''ایک اندازہ کے مطابق ۱۸۵۷ء میں پانچ لاکھ مسلمانوں کو پھانسیاں دی گئیں۔ جو بھی معزز مسلمان انگریزوں کے ہاتھ لگ گیا اس کو ہاتھی پر بٹھایا گیا اور درخت کے نیچے لے گئے۔ پھندا اس کی گردن میں ڈال کر ہاتھی کو آگے بڑھایا گیا۔ لاشیں پھندے میں جھول گئیں۔ آنکھیں ابل پڑیں۔ زبان منہ سے باہر نکل آئی۔''

☆☆☆☆☆☆☆

ورودِ دہلی اور سرگرم جدوجہد

حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی (کراچی)

مولانا فضل حق خیر آبادی آغازِ جہاد یعنی مئی ۱۸۵۷ء ہی سے دہلی میں تھے۔ دہلی ان کا وطن و مسکن تھا۔ ان کے غالبؔ، ان کے آزردہ اور ان کے اہل و عیال بھی یہیں تھے۔ پھر غدر کا آغاز ''رمضان'' میں ہوا تھا اور رمضان عموماً ہر روزہ دار اپنے اہل و عیال میں گذارتا ہے۔ ۲۵؍مئی کو عید الفطر تھی۔ عید پر مسافر ضرور اہل و عیال سے آملتا ہے۔ مختصراً یہ کہ عقلاً ان کا اس زمانے میں دہلی میں ہونا مستبعد اور خلافِ قیاس نہیں، قرینِ قیاس ہے۔

منشی جیون لال کے یہ لکھ دینے سے کہ وہ ۱۶؍اگست کو بہادر شاہ سے ملے تھے یہ کب لازم آتا ہے کہ وہ اس تاریخ سے پہلے دہلی میں نہیں تھے؟ اور یہ کیا ضروری ہے کہ مولانا جب بھی دربار میں آئے ہوں جیون لال ضرور لکھے؟ مثلاً ۱۹؍اگست کو بھی عبداللطیف کے بیان کے مطابق مولانا بادشاہ سے ملے تھے۔ (غدر کا تاریخی روزنامچہ از خلیق احمد نظامی) مگر جیون لال کا روزنامچہ خالی ہے۔ اگر جیول لال کے ان الفاظ سے کہ ''مولوی فضل حق شریکِ دربار ہوئے اور انھوں نے ایک اشرفی نذر کی'' یہ استدلال کیا جاسکتا ہے کہ یہ پہلی بار شریکِ دربار ہونے کا ثبوت ہے تو جیون لال نے ۱۰؍اگست کے روزنامچے میں جو یہ لکھا ہے کہ حکیم احسن اللہ شریکِ دربار ہوئے اور ایک اشرفی پیش کی'' (ص ۲۱۳) تو کیا اس کا یہ مطلب ہوا کہ حکیم صاحب بھی پہلی بار کہیں سے دہلی ۱۰؍اگست ۱۸۵۷ء کو آئے تھے اور پہلی بار شریک دربار ہوئے تھے؟

حکیم احسن اللہ خاں نے اپنے روزنامچے میں لکھا ہے کہ مولانا نے بہادر شاہ سے کہا کہ مجاہدین کی مالی اعانت کیجیے۔ بادشاہ نے خزانہ خالی اور مال گذاری وصول نہ ہونے کا عذر کیا تو مولوی صاحب نے جواب دیا کہ:

''آپ کے تمام ملازمین نااہل ہیں...... کسی ہوشیار آدمی کو رسد کی فراہمی پر

مامور کیجیے۔ میرے لڑکے (مولانا عبدالحق خیر آبادی) اور دوسرے اعزہ تحصیل داری کا کام انجام دیں گے اور رسد بھی فراہم کریں گے۔"

مولوی ذکاءاللہ دہلوی لکھتے ہیں:

"جس تاریخ کو سپاہ آئی (۱۱رمئی) دوسرے روز (۱۲رمئی) قلعے میں اکابر شہر کی ایک مجلس مقرر ہوئی کہ شہر کا اور سپاہ کی رسد رسانی کا انتظام کیا جائے۔ اگر بندوبست نہیں ہوگا تو وہ (سپاہی) سارے شہر کو لوٹ کر کھا جائیں گے۔ اس کا اہتمام محبوب علی صاحب اور میر نواب پسر تفضل حسین خاں وکیل کے سپرد ہوا۔" (ص ۶۷۹۔ تاریخ عروجِ عہد انگلشیہ)

حکیم احسن اللہ نے مولانا اور بہادر شاہ کی گفتگو کی تاریخ نہیں لکھی، مولوی ذکاءاللہ نے تاریخ متعین کر دی ہے۔ مولانا کے مشورے کی بنا پر ان کے ایک عزیز میر نواب کو رسد رسانی کی ذمہ دار سب کمیٹی کا رکن بنا دیا گیا۔ میر نواب مولانا کے داماد سید احمد حسین رسوا خیر آبادی کے حقیقی بھائی تھے۔ احمد حسین اور میر نواب دونوں سید تفضل حسین خاں کے بیٹے تھے جو غالب کے دوست تھے۔ "سبد باغ" میں سید صاحب کے نام غالب کے ۷ خطوط ہیں۔ مومن خاں سے سید تفضل حسین خاں کے تعلقات اور بھی گہرے تھے۔ انھوں نے مومن کے بیٹے احمد نصیر کو متبنیٰ کر لیا تھا۔ "انشائے مومن" میں کئی خطوط سید صاحب کے نام ہیں۔ مومن نے سید صاحب کے مکان کی تعمیر، باغ کی تعمیر وغیرہ پر بھی قطعاتِ تاریخ کہے تھے اور میر نواب کی شادی پر بھی (۱۲۶۱ھ/ ۱۸۴۵ء) قطعۂ تاریخ لکھا تھا۔ (کلیاتِ مومن۔ ص ۱۸۹)

بہر حال میر نواب مولانا فضل حق کے قریبی عزیز اور معتمد تھے اور ان کا دو رکنی سب کمیٹی میں ۱۲رمئی ۱۸۵۷ء کو انتخاب مولانا فضل حق کی بہادر شاہ سے ۱۱رمئی کی گفتگو کے نتیجے میں ہوا تھا۔

مولوی ذکاءاللہ لکھتے ہیں:

"انھوں (مولانا فضل حق) نے بادشاہ (بہادر شاہ) کے لئے ایک دستور العمل سلطنت لکھا تھا۔" (تاریخ عروجِ سلطنت انگلشیہ۔ ص ۶۸۷)

مولوی ذکاءاللہ ہی کا بیان ہے کہ:

"۹رجولائی ۱۸۵۷ء کو اول حکم بادشاہ کا جو صادر ہوا وہ یہ تھا کہ گائے کہیں

ذبح نہیں کی جائے گی۔'' (ایضاً ۲۶۰۔ نیز غدر کے صبح وشام۔ ص ۱۶۳۔ منشی جیون لال)

ظاہر ہے کہ ۹ر جولائی کو جس دستور کی پہلی دفعہ با قاعدہ نشر اور نافذ کر دی گئی تھی وہ دستور اُسی دن تو بہادر شاہ کو پیش نہیں ہوا ہوگا؟ بہادر شاہ کے مطالعہ، نقد ونظر، ردوکد، تذبذب وتامل اور اس کے مشیروں کے مشوروں کی ہفت خواں طے ہونے کے بعد اس کی بعض دفعات کے نشر ونفاذ کا فیصلہ ہوا ہوگا۔ اور یہ بات تو بہادر شاہ سے متعلق تھی۔ جس شخص نے اسے مرتب کیا تھا تو یہ سلطنت کا دستور تھا، خطوطِ غالبؔ نہیں تھے کہ بیٹھے اور لکھ مارا۔ مطالعہ، فکر ومشورت کی جانے کن کن جاں کاہیوں کے بعد یہ تسوید وتبییض کی منزل سے گذرا ہوگا۔

بہرحال! مولوی ذکاء اللہ کے دونوں مندرجہ بالا اقتباسات سے مولانا فضل حق کا جولائی سے بہت پہلے دہلی میں ہونا ثابت ہوتا ہے اور حکیم احسن اللہ خاں اور مولوی ذکاء اللہ کے سابقہ اقتباسات سے مولانا کا ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء کو دہلی میں ہونا متعین ہوجاتا ہے۔

ڈاکٹر مہدی حسین نے بھی ذکاء اللہ کے اس اقتباس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مولانا آغاز غدر کے فوراً بعد (شارٹ لی آفٹر دی آؤٹ بریک آف میوٹنی) دہلی آ گئے تھے۔ (ص ۳۸۹)

مولانا نے ۲۶ر جولائی کو فارسی میں ایک خط بنام مرزا مغل لکھا ہے جس میں مطالبہ کیا ہے کہ ان کی جنرل بخت خان سے ملاقات میں جو گفتگو ہوئی ہے اس کی تفصیل سے مجھے (فضل حق) آگاہ کریں۔ (میوٹنی پیپرس بکس ۱۰۰ نمبر ۹۶، ۲۶ر جولائی۔ ڈاکٹر مہدی حسین۔ ۳۹۱)

مالک رام صاحب نے انقلاب ۱۸۵۷ء میں مولانا فضل حق کے عدم شرکت کا افسوسناک اور بے بنیاد ذکر اپنے اس مضمون (تحریکِ دہلی جون ۱۹۶۰ء) میں کیا ہے۔ جس میں انھوں نے مولانا فضل حق کے مقدمہ کی مِسل نیشنل آرکائیوز آف انڈیا سے حاصل کر کے اس کے مشمولات کا اردو ترجمہ شائع کر دیا ہے۔ اس مِسل میں وہ فیصلہ بھی اسپیشل کمشنر نے مولانا کے مقدمے کا دیا تھا۔ اس میں مولانا کی دہلی کی باغیانہ سرگرمیوں کا اس طرح ذکر کیا ہے:

> ''اس کی گرفتاری کے بعد دہلی سے اس کے پرانے تعلقات کے باعث وہاں کے حکام سے بھی اس کے متعلق استصواب کیا گیا تو کمشنر دہلی نے اس کے جو جوابات تحریر کیے ان سے معلوم ہوا کہ ۱۸۵۷ء میں دہلی میں بھی اس کی سرگرمیاں بعینہٖ اسی قسم کی (باغیانہ) تھیں ...... وہ الور میں ملازم تھا۔

یہاں سے وہ دیدہ ودانستہ دہلی آیا اور اس کے بعد وہ باغیوں اور بغاوت کے قدم بقدم چلتا رہا۔“

سقوطِ دہلی کے بعد اودھ میں مولانا نے تحریکِ جہاد میں جو حصہ لیا اس کا تذکرہ کرتے ہوئے کمشنر لکھتا ہے:

”وہ ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء کے دوران میں بغاوت کا ”سرغنہ“ رہا اور دہلی اور اودھ اور دوسرے مقامات پر اس نے لوگوں کو بغاوت اور قتل کی ترغیب دی...... اس نے بونڈی کے مقام پر ۱۸۵۸ء میں باغی سرغنے مموخاں کی مجلسِ مشاورت میں ”نمایاں حصہ“ لیا۔ اس نے بونڈی کے مقام پر مئی ۱۸۵۸ء میں ایک سرکاری ملازم عبدالحکیم کو قتل کرنے کی ترغیب دی...... اس نے قرآن کی آیات پڑھیں اور ان کے من مانے معنی کیے اور اصرار کیا کہ انگریزوں کے ملازم کافر اور مرتد ہیں اور اس لئے شریعت کے نزدیک ان کی سزا قتل ہے...... وہ باغیوں کی مجلس شوریٰ (پریوی کونسل) کا اہم ”رکن“ تھا...... یہ بات ان ایام میں عام طور پر مشہور تھی کہ چند آدمی بیگم (حضرت محل) کے مشیرانِ خاص ہیں۔ باغی فوج میں ان کی ”اربعہ شوریٰ“ کے نام سے شہرت تھی، بلکہ کبھی کبھی انھیں ”کچہری پارلیمنٹ“ کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔ اس شوریٰ میں ملزم (مولانا) بہت ممتاز تھا...... یہ تو ظاہر ہے کہ ملزم بہت قابل آدمی ہے، لیکن جس طرح اوپر بیان ہوا اس نے بے ایمانہ ہوس یا مذہبی تعصب کے باعث باغیوں سے اپنا رشتہ جوڑا اور ان کا مشیر بن گیا۔ وہ خطرناک ترین آدمی ہے جو کسی وقت بھی بے حد نقصان پہنچا سکتا ہے اور اس لیے انصاف اور امن عامہ کا تقاضا ہے کہ اسے ملک بدر کر دیا جائے...... ایسے شخص کو سخت ترین سزا ملنا چاہیے اور اسے خاص طور سے ہندوستان سے خارج کر دینا چاہیے۔“

عدالت کے اس فیصلے کے علاوہ ہم مولانا فضل حق کی شرکت جہاد کے ثبوت میں پانچ معاصرین کی شہادت پیش کرتے ہیں:

(۱) منشی جیون لال کا گذشتہ صفحات میں ذکر آ چکا ہے جو ۱۶؍اگست ۲/ ۶/ ۷؍ستمبر کو لال قلعے میں مولانا کو موجود پاتا ہے۔ ایک دن مولانا نے بادشاہ سے صورت حالات کے متعلق گفتگو کی۔ ایک دن مولانا نے بادشاہ کو (موجودہ) یوپی میں مجاہدین کی سرگرمیوں کے متعلق اطلاع فراہم کی۔ ایک دن بادشاہ کے دربار میں تمام امراؤ روسا کے ساتھ مولانا بھی شریک ہوئے۔

(۲) ایک دوسرا معاصر عبداللطیف ۱۹؍اگست ۱۸۵۷ء کے روزنامچے میں لکھتا ہے:

"جب ہنگامہ برپا ہوا تو مولوی فضل حق آئے۔ دربار میں حاضر ہوئے۔ نذر پیش کی۔ روپیہ صدقے اتارا۔ انھیں انتظام سنبھالنے کی خواہش تھی۔"

(ص ۹۶۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ۔ مرتبہ خلیق احمد نظامی)

(۳) دورانِ غدر میں دہلی کے کوتوال سید مبارک شاہ رام پوری (قاضی فیض اللہ کے بعد کوتوال شہر دہلی) کا بیان ہے کہ جنرل بخت خان، مولوی سرفراز علی اور مولانا فضل حق پر مشتمل ایک کنگ کونسل تشکیل دی گئی۔ (انڈیا آفس منوسکرپٹس آف آر ایم ایڈورڈس۔ ٹرانسلیشن آف سید مبارک شاہز نیریٹیو آف سیز آف دی دہلی، بحوالہ گریٹ ریولیشن آف ۱۸۵۷ء، ص ۱۸۲۔ از ڈاکٹر سید معین الحق کراچی ۱۹۶۸ء)

(۴) انگریزوں کا ایک مخبر تراب علی یکم ستمبر ۱۸۵۷ء کے خفیہ خبرنامے میں برطانوی حکام کو مطلع کرتا ہے کہ باغیوں نے ایک انتظامی مجلس تشکیل دی ہے جس کا نام انھوں نے کوٹ (Kote) (کذا) رکھا ہے۔ اس کے ارکان میں جنرل غوث محمد خاں، بریگیڈیر ہیرا سنگھ، جنرل بخت خان، محمد شفیع رسالدار، حیات محمد رسالدار، قادر بخش صوبے دار سفر مینا، تھو صوبیدار، ہردت صوبیدار وغیرہ کے علاوہ ہر رجمنٹ کے پانچ پانچ سپاہی بھی شامل ہیں اور

"Molvi Fazllehaq is Also A Member"

(مولوی فضل حق بھی اس کورٹ کے ایک رکن ہیں) (میوٹنی ریکارڈ کرسپنڈنس۔ لاہور ۱۹۱۱ء۔ مراسلہ ۲۷۹۔ از جی سی بارنس کمشنر کلکٹر سیس ستلج بنام سکریٹری چیف کمشنر پنجاب۔ مورخہ ۳؍ستمبر ۱۸۵۷ء)

(۵) ایک اور نامور معاصر حکیم احسن اللہ خاں اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں:

"دوسرے روز مولوی فضل حق آئے اور نذر پیش کی۔ وہ باغی فوج کی بڑے

زور شور سے تعریف کر رہے تھے۔ انھوں نے بادشاہ سے کہا! اب وقت کا تقاضہ ہے کہ باغیوں کو رقم اور سامانِ رسد کی مدد پہنچائی جائے تاکہ انھیں کچھ سہارا ہو۔ بادشاہ نے کہا رقم کہاں ہے؟ رہا رسد کا تو وہ پہنچی تھی، مگر ناکافی تھی اور اس کی وجہ ان باغیوں کا عوام کے ساتھ غلط رویہ ہے۔

مولوی صاحب نے کہا! حضور کے تمام ملازمین نااہل ہیں۔ دور اور قریب کے تمام حکمرانوں سے رقم کا مطالبہ کرنے کی اجازت دیجیے اور کسی ہوشیار آدمی کو رسد کی فراہمی پر مامور کرنے دیجیے۔ میرے لڑکے (مولانا عبدالحق) اور دیگر اعزہ تحصیل کا کام انجام دیں گے اور رسد بھی فراہم کریں گے۔

بادشاہ نے جواب دیا! آپ تو یہیں ہیں، آپ انتظام سنبھالیے۔ مولوی صاحب نے جواب دیا! میرے بھتیجے اور دوسروں کو گوڑ گانوہ کی تحصیلداری اور کلکٹری کا پروانۂ تقرر جاری کیا جائے وہ سب انتظام کرلیں گے اور الور، جھجر، بلّب گڑھ اور پٹیالہ کے راجاؤں کے نام بھی (رقم کے مطالبے کے) پروانے جاری کیجیے۔ پٹیالہ کا راجہ اگرچہ انگریزوں سے ملا ہوا ہے لیکن اگر دوستانہ مراسلت کی جائے تو وہ ساتھ آجائے گا۔ بادشاہ نے بتایا کہ پیرزادہ ابوالسلام کی درخواست پر بخت خان نے راجہ پٹیالہ کو ایک پروانہ بھیج دیا ہے، مگر ابھی تک اس کا جواب نہیں آیا۔

مولوی صاحب نے کہا میں اپنے بھائی (فضل عظیم) کو جو راجہ کے یہاں ملازم ہیں، لکھوں گا کہ وہ جلد جواب بھجوائیں۔

مولوی صاحب جب بھی بادشاہ کے پاس آتے بادشاہ کو مشورہ دیتے کہ جہاد کی مہم میں اپنی رعایا کی ہمت افزائی کریں اور ان کے ساتھ باہر (میدان میں) بھی نکلیں۔ فوجی دستوں کو جس حد تک ممکن ہو بہتر معاوضہ دیں ورنہ اگر انگریز جیت گئے تو صرف خاندان تیموریہ نہیں بلکہ تمام مسلمان نیست و نابود ہو جائیں گے۔ (یادداشت حکیم احسن اللہ خاں۔ ص ۲۳۔ مرتبہ ڈاکٹر سید معین الحق (کراچی) ۱۹۵۸ء)

تقریباً یہی بات حکیم احسن اللہ نے بہادر شاہ کے مقدمے کے دوران عدالت میں شہادت

دیتے ہوئے کہی تھی:

”زمین داران گوڑ گانوہ نے بادشاہ کوایک درخواست ارسال کی تھی جس میں بدنظمی کا ذکر کر کے التجا کی تھی کہ کوئی افسر نظم ونسق کے لئے مقرر کیا جائے۔ مولوی فضل حق نے جوالور سے آئے تھے، اپنے بھانجے کا (جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا) کی سفارش کی کہ وہ وہاں مقرر کر دیا جائے، کیوں کہ گورنمنٹ برطانیہ کے دورِ حکومت میں بھی وہ اس ضلع میں مقرر تھا۔ چنانچہ یہ شخص ضلع دار مقرر کیا گیا، مگر میں آگاہ نہیں ہوں کہ وہ گوڑ گانوہ گیا یا نہیں؟ البتہ اتنا معلوم ہے کہ زوالِ دہلی کے ۱۵/ ۲۰ روز قبل یہ تقرر ہوا تھا۔ مولوی فضل حق نے بھی کئی تحصیل داروں کو ضلع دار کی نیابت میں مقرر کیا گیا تھا۔“ (بہادر شاہ کا مقدمہ۔ ص ۲۵۶ و ۲۵۷)

انگریزوں کے جاسوس جیون لال نے اپنے روزنامچے میں اس تاریخ کا تعین کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

”۱۹/ اگست ۱۸۵۷ء: عبدالحق خلف مولوی فضل حق اور مولوی فیض احمد لگان وصول کرنے کی غرض سے گوڑ گانوہ گئے۔“ (ص ۲۲۲۔ غدر کی صبح و شام۔ مطبوعہ دہلی ۱۹۲۶ء)

یہ پانچوں معاصر شہادتیں ان کی دہلی کی باغیانہ سرگرمیوں میں شرکت سے متعلق تھیں۔ ستمبر ۱۸۵۷ء میں سقوطِ دہلی کے بعد مولانا نے دہلی کو بادیدۂ نم الوداع کہا اور اس کے بعد وہ جنوری ۱۸۵۹ء تک مسلسل دوسرے مجاہدین کے ساتھ اودھ میں سرگرم جہاد رہے، اس لئے اودھ کے معاصر حکام کی شہادت ملاحظہ ہو:

اودھ کے چیف کمشنر کا سکریٹری ہمیر پور کے کلکٹر کے نام ۸/ دسمبر ۱۸۵۸ء کو اپنے سرکاری مراسلے میں لکھتا ہے:

”باغی بسوا میں جو لکھنؤ سے شمال مغرب میں پچاس میل کے فاصلے پر ہے، شکست کھا کر ۵/ دسمبر کو گنگا فرار ہو گئے ...... ان کی تعداد ۹۰۰ سوار، جن میں ۴۰۰ پوری طرح مسلح ہیں اور باقی سپاہیوں کے پاس اسلحہ کافی نہیں ہے۔ ۳۰۰ پیدل وغیرہ تھے۔ ان میں سے ۱۰۰ عورتیں، ۶ ہاتھی، ایک توپ

جس کا نام گروہ ہے۔ اس جماعت کے لیڈر فیروز شاہ شہزادہ دہلی، لکڑ شاہ، گلاب شاہ عرف پیر جی، محسن علی خاں ساکن منئو شمس آباد فرخ آباد (جو خود کو یورپین ظاہر کرتا ہے) اور مولوی فضل حق سابق سررشتہ دار کمشنر دہلی جس کے بہت سے اعزہ اعلیٰ مناصب حکومت پر ہیں اور جس کا بھائی پٹیالہ میں راجہ ہری سنگھ کا ملازم ہے۔'' (فریڈم اسٹرگل ان اتر پردیش حصہ دوم ص ۵۶۳ وحصہ پنجم ص ۸۱۰۔ لکھنؤ ۱۹۵۸ء (انگریزی)

یہی سکریٹری ۱۱ر دسمبر ۱۸۵۸ء کو گورنمنٹ آف انڈیا کے سکریٹری کے نام اپنے ایک سرکاری مراسلے میں لکھتا ہے:

''مندرجہ ذیل لوگوں کے چلے جانے کے بعد حکومت کو قیامِ امن میں کافی سہولت ہورہی ہے۔ فیروز شاہ، لکڑ شاہ، مولوی فضل حق، جو ہماری حکومت کا دشمن جاں ہے، حالاں کہ حکومت نے اسے اور اس کے اعزہ کو اعلیٰ مناصب عطا کیے تھے۔'' (فریڈم اسٹرگل ص ۵۶۵)

لکھنؤ چیف کورٹ میں غدر سے متعلق بستہ (فائل) میں ٹھیک اسی دور کے ایک حاکم کا مراسلہ ہے۔ جس میں محمدی (ضلع لکھیم پور کھیری) کے قرب وجوار میں مولانا فضل حق اور ان کے رفقائے جہاد کی سرگرمیوں کے تجسس کی جو کوشش برطانوی حکام کر رہے تھے اس کا ذکر ہے اور لکھا ہے کہ:

''کچھ لوگ مولوی فضل حق کی صحیح خبر لانے کے لئے بھیجے گئے ہیں جو اپنے تبعین کے ساتھ شاہ آباد کی طرف روانہ ہوئے ہیں۔'' (فریڈم اسٹرگل ص ۵۱۸)

معاصرین کے بعد اب قریب تر عہد کے مؤرخین کے حوالے بھی ملاحظہ ہوں۔ مولانا کی وفات کے صرف ۹ سال بعد مشہور انگریز مصنف ہنٹر اپنی کتاب ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' میں مدرسۂ عالیہ کلکتہ کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کے اس وقت کے صدر مدرس علامہ عبدالحق خیرآبادی فرزند علامہ فضل حق خیرآبادی کے متعلق لکھتا ہے۔

''موجودہ ہیڈ مولوی اس عالمِ دین کے صاحبزادہ ہیں، جن کو ۱۸۵۷ء کے غدر نے ''نمایاں کر دیا تھا اور جنھوں نے اپنے جرموں کا خمیازہ اس طرح بھگتا تھا کہ بحر ہند کے ایک جزیرے میں تمام عمر کے لئے جلا وطن

کردیئے جائیں۔اس غدار عالم دین کا کتب خانہ جس کو حکومت نے ضبط کرلیا تھا اب کلکتہ کالج میں موجود ہے۔'' (ص۲۹۴۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان از ڈبلیو، ڈبلیو، ہنٹر۔مترجمہ ڈاکٹر صادق حسین، طبع دوم لاہور ۱۹۵۵ء)

مولوی ذکاء اللہ بھی ان لوگوں میں سے ہیں جو سن ستاون میں ۲۵ رسال کے تھے اور دہلی کی جنگِ آزادی کے عینی شاہدوں میں سے تھے۔اور انھوں نے اس کے ۲۰/ ۲۵ سال بعد ہی اپنی تاریخ مرتب کی۔ان کا بیان ہے کہ:

''ان (مولانا) کو اس ''بغاوت' کے سبب سے جلاوطنی کی سزا ملی تھی۔''

(ص۶۸۷۔تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ)

خود مولانا فضل حق خیرآبادی نے اپنے عربی رسالے "الثورة الهندية" (باغی ہندوستان) میں جو واقعاتِ انقلاب ۱۸۵۷ء پر ایک مستند و معتمد دستاویز بھی ہے۔اگرچہ اپنی سرگرمیوں کے متعلق ازراہِ انکسار اور مدحِ خود سے احتراز کے پیش نظر یا ممکن ہے اس وقت کے مہیب و پُرخطر ماحول کے باعث بہت کم لکھا ہے مگر پھر بھی اتنا ضرور لکھ گئے ہیں کہ دہلی پہنچ کر:

اشرت الىٰ الناس بما اقتضىٰ رأى و قضىٰ بہ عقلى. فلم يأتمروا بما اشرت و لم يأتمروا بما امرت.

(تحریکِ آزادی کے سلسلے میں) میری جو رائے تھی اور میری عقل کا جو فیصلہ تھا میں نے لوگوں کے سامنے رکھا مگر انھوں نے میری رائے اور میری ہدایت کو نہ مانا۔

اسی طرح انقلاب ہی سے متعلق اپنے قصیدۂ ہمزیہ میں انڈمان سے لکھتے ہیں:

قد قمت ازجى القاعدين الى الوغى.

میں (تھک کر) بیٹھ جانے والوں کو مسلسل ہمت دلاتا رہا۔

....

(ص۵۷تا۹۰۔فضل حق خیرآبادی اور ۱۸۵۷ء۔ازمحموداحمد برکاتی ٹونکی۔مطبوعہ کراچی ۱۹۷۵ء)

قواعد وضوابط کورٹ

ترتیب وتدوین: علامہ فضل حق خیرآبادی

بزمانۂ انقلاب ۱۸۵۷ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(ترجمہ از فارسی) از آنجا کہ واسطے رفع برہمی سررشتہ اور موقوفی بدانتظامیِ طریقہ فوجی اور ملکی کے مقرر ہونا دستور العمل کا واجب اور مناسب اور واسطے عمل درآمد دستور العمل کے اولاً معین ہونا کورٹ کا ضروری ہے۔ اس لئے حسب ذیل قواعد لکھے جاتے ہیں:

(۱) ایک کورٹ قائم کی جائے اور اس کا نام کورٹ ایڈمنسٹریشن بمعنی جلسۂ انتظامِ فوجی و ملکی رکھا جائے۔

(۲) اس جلسے میں دس آدمی مقرر کیے جائیں، اس تفصیل سے کہ چھ جنگی اور چار ملکی ہوں اور جنگیوں میں دو شخص پلٹن پیادگان سے اور دو شخص رسالہ ہائے سواروں سے اور دو سررشتہ توپ خانہ سے منتخب کیے جائیں اور ملکی چار شخص۔

(۳) ان دس شخصوں سے ایک شخص باتفاق غلبہ آرائے پریسیڈنٹ یعنی صدر جلسہ اور ایک شخص وائس پریسیڈنٹ یعنی نائب صدر مقرر ہو اور رائے صدر جلسہ کی برابر دو رائے کے قرار پاوے گی اور ہر ایک سررشتہ میں بقدر ضرورت سکریٹر مقرر کیے جائیں اور پانچ گھنٹے ہر روز (؟) جلسہ کورٹ کا......

(۴) ان شخصوں کے مقرر ہونے کے وقت حلف ان باتوں کا لیا جائے کہ کام کو بڑی دیانت اور امانت سے بلا رو رعایت، کمال جانفشانی سے اور غور و فکر سے سرانجام کریں گے اور کوئی دقیقہ دقائق متعلقہ انتظام سے فروگذاشت نہ کریں گے۔ اور حیلۃً اور صراحتاً اخذِ اجرت یا رعایت کسی طرح کی کسی لحاظ سے وقت تجویز امور انتظام کورٹ میں نہ کریں گے۔ بلکہ ہمیشہ ساعی اور سرگرم ایسے امورات سلطنت

میں مصروف رہیں گے کہ جس سے استحکامِ ریاست اور رفاہ اور آسائشِ رعیت ہو اور کسی امر مجوزہ کورٹ کو بے اجازت کورٹ اور صاحبِ عالم قبلِ اجراء اوس کے صراحتاً یا کنایتاً کسی پر ظاہر نہ کریں گے۔

(۵) انتخاب اشخاص کورٹ کا اس طریقے سے کہ غلبۂ آراء سے دو دو شخص پلٹن پیادگان اور رسالہ ہائے سواران سے اور سررشتہ توپ خانہ جنگی سے جو قدیم الخدمت اور ہوشیار اور واقف کار اور لائق و عقیل ہو کیے جاویں اور اگر کوئی شخص ہوشیار، بہت عقیل و فہیم اور لائقِ انصرام کارکورٹ ہو اور شرط قدیم الخدمتی اس میں نہ پائی جائے تو یہ ایک امر خاص ان صورتوں میں مانع تقرر ایسے شخص کا نہ ہوگا اور اسی طرح تقرر چار شخص ملکی کا بھی عمل میں آوے گا۔ بعد مقرر ہونے دس شخصوں کے اگر کوئی شخص جلسۂ انتظام کورٹ میں رائے اپنی کسی امر میں ایسی خلافِ دیانت اور امانت اور محمول او پر رعایت کسی کے ہووے گا۔ تو...... کامل غلبہ آرائے کورٹ سے وہ شخص موقوف کیا جاوے گا اور دوسرا شخص حسبِ قاعدہ پانچویں (۵) بمقام اس کے انتخاب ہوگا۔

جو امورات انتظام کے پیش آویں اوّل تجویز ان کی کورٹ میں ہوگی —— اور بعد منظوری صاحب عالم بہادر کے اطلاع رائے کورٹ سے حضور والا میں ہوتی رہے گی۔

(۷) بعد مرتب ہونے رائے غلبہ آرائے جلسۂ کورٹ سے واسطے منظوری کے پیش گاہ حضور صاحب عالم بہادر میں پیش ہوں گے اور کورٹ ماتحت حکومت صاحب عالم بہادر ممدوح کے رہے گی اور کوئی امر امور انتظامی، جنگی و ملکی کے تجویز کورٹ اور بلا منظوری صاحب عالم محتشم الیہ اور بلا اطلاع حضور والا قابلِ اجرائی نہ ہوگا۔ اور درصورت اختلاف رائے صاحب عالم بہادر بعد تجویز ثانی کورٹ وہ رائے بحالت اختلاف بوساطت صاحب منظم الیہ پیش گاہ حضور ظل سبحانی میں پیش ہو اور اس میں حکم حضور کا ناطق ہوگا۔

(۸) کورٹ میں سوائے اشخاص مقرر جلسہ کے بجز صاحب عالم بہادر اور حضرت ظل سبحانی

کوئی شخص شریکِ جلسہ اور حاضر نہ ہوگا اور جب اشخاص معینہ کورٹ میں سے بعذر قوی لائقِ پذیرائی ایک شخص اپنے زمرہ مقرر سے حاضر جلسۂ کورٹ نہ ہوسکے تو رائے غلبہ آرائے اشخاص مابقی حاضرین جلسۂ کورٹ کے بمنزلہ رائے غلبہ رائے کل جلسۂ کورٹ کے متصور ہوگی۔

(۹) جب کوئی شخص کورٹ میں سے بہ نسبت کسی امر کے رائے اپنی پیش کرنی چاہے تو اولاً اتفاق ایک رائے دوسرے شخص کا پہلے کرکے اس وقت رائے اپنی متفق علیہ دو شخص کورٹ میں پیش کریں۔

(۱۰) جس وقت کوئی امر کورٹ میں موافق قاعدہ نویں (۹) کے پیش ہو اول پیش کرنے والا تقریر اپنی کورٹ میں بیان کرے اور جب تک بیان اس کا تمام نہ ہو کوئی شخص اس میں دخل نہ کرے۔ اہل کورٹ میں سے اگر کسی کو کچھ اعتراض ہو تو وہ پہلے اپنا

---

[۱] یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ پاپۂ حرمین حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی (متوفی ۱۳۰۸ھ/ ۱۸۹۰ء) مولانا عبدالسمیع بیدلؔ رام پوری سہارن پوری (متوفی ۱۳۱۸ھ/ ۱۹۰۰ء) کے استاذِ مکرم اور حاجی الحرمین حضرت حاجی امداد اللہ فاروقی تھانوی مہاجر مکی (متوفی ۱۳۱۷ھ/ ۱۸۹۹ء) آپ کے مرشدِ اعظم ہیں۔ یہ دونوں حضرات مذہب اہل سنت، مسلک حنفیہ، مشرب صوفیہ کے اساطین وارکان ہیں۔ معمولات ومراسم سوادِ اعظم کے حامی وداعی ہیں۔ مولانا بیدلؔ رام پوری سہارن پوری کی معرکۃ الآرا کتاب "انوارِ ساطعہ در بیان مولود وفاتحہ" (طبع اول ۱۳۰۲ھ/ ۱۸۸۴ء، طبع دوم ۱۳۰۶ھ/ ۱۸۸۸ء) کے مؤید ومصدق ہیں۔

ان دونوں حضرات کے ارشادات وتصدیقات نہایت اہم اور مسلمانانِ ہند کے لئے بے حد مفید ہیں اس لئے ان کے بعض حصے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں۔

فی الحقیقت نفسِ مطلب کتاب "انوارِ ساطعہ" موافقِ مذہب ومشرب فقیر وبزرگان فقیر است۔ خوب نوشتید۔ جزاکم اللہ خیر الجزاء۔ ۲۲رشوال ۱۳۰۴ھ مرقوم بنام مولانا عبدالسمیع بیدلؔ رام پوری (ص ۴۴۵۔ انوارِ ساطعہ طبع چہارم مبارک پور اعظم گڑھ ۱۴۲۸ھ/ ۲۰۰۷ء)

فقیر مجلس میلاد مبارک کا مع ہیئتِ کذائیہ معمولۂ علمائے ثقات وصلحا ومشائخ کرام بارہا اقرار کر چکا ہے اور اکثر اس کا عامل ہے۔ جیسا کہ فقیر کی دیگر تقریرات وتحریرات سے یہ مضمون ظاہر ہے۔ فقیر کو اس مجلس شریف کے باعثِ حسنات وبرکات کے معتقد ہونے کے علاوہ یہ عین الیقین ہے کہ اس مجلس مبارک میں فیض انوار وبرکات ورحمتِ الٰہی کا نزول ہوتا ہے۔ ۲۰ر رجب ۱۳۰۷ھ مرقوم بنام مولانا نذیر احمد رام پوری ثم حیدرآبادی (متوفی ۱۳۲۳ھ)۔ (ص ۴۲۳۔ نور چہارم۔ انوارِ ساطعہ)

دیکھو! ہندوستان میں سیکڑوں مذاہب کفریہ وعقائد باطلہ مخالفِ دین وبیخ کن اسلام ظاہر ہوتے جاتے ہیں۔ اور کیسے کیسے الزام واعتراض وشبہات وشکوک مذہب اسلام پر وارد کرتے جاتے ہیں۔ پس ایسے وقت میں آپس

اعتراض ظاہر کرے تا تمام ہونے اس کے بھی کوئی دخل نہ دے۔ اگر معترض پر کوئی تیسرا شخص تقریر درباب اصلاح یا ترمیم کسی طرح کی کمی بیشی کے ساتھ پیش لاوے

بقیه صفحه ۵۱

کے مجادلہ کی جگہ اس کی تردید کرنی چاہیے اور قرآن شریف کی خوبیاں وفضائل اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محامد و مکارمِ اخلاق ومحاسن اوصاف کو ہر مقام وہر شہر وقریہ میں نہایت زور وشور سے مشتہر کرنا چاہیے۔

ایسے وقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محامدِ اوصاف ومکارمِ اخلاق کو مشتہر واشاعتِ عام کرنے کے لئے ہر مقام میں مجلسِ مولود شریف کا چرچا بڑا عمدہ ذریعہ ومستحسن وسیلہ ہے۔

ذوالقعدہ ۱۳۰۷ھ۔ مرقوم بنام مولانا محمود حسن دیوبندی ومولانا خلیل احمد انبیٹھوی سہارن پوری۔ (ص ۴۲۴۔ انوار ساطعہ)

پایۂ حرمین مولانا رحمت اللہ کیرانوی علیہ الرحمہ والرضوان (متوفی ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء) تحریر فرماتے ہیں:

...... میرے اساتذۂ کرام اور میرا عقیدہ مولد شریف کے باب میں قدیم سے یہی تھا اور یہی ہے۔ بلکہ بہ حلف سچ سچ ظاہر کرتا ہوں کہ میرا ارادہ یہ ہے کہ ع بریں زیستم ، ہم بریں بگذرم۔

اور عقیدہ یہ ہے کہ انعقاد مجلس میلاد بشرطے کہ منکرات سے خالی ہو۔ جیسے تغنی اور باجہ اور کثرت سے روشنی بے ہودہ نہ ہو۔ بلکہ روایات صحیحہ کے موافق ذکر معجزات اور ذکر ولادتِ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا جاوے اور بعد اس کے طعام پختہ یا شیرینی بھی تقسیم کی جاوے اس میں کچھ حرج نہیں۔

بلکہ اس زمانے میں جو ہر طرف سے پادریوں کا شور اور بازاروں میں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے دین کی مذمت کرتے ہیں اور دوسری طرف سے آریہ لوگ۔ خدا ان کو ہدایت دے۔ جو پادریوں کی طرح بلکہ ان سے زیادہ شور مچا رہے ہیں، ایسی محفل کا انعقاد ان شروط کے ساتھ جو میں نے اوپر ذکر کیں اس وقت فرض کفایہ ہے۔

میں مسلمان بھائیوں کو بہ طور نصیحت کے کہتا ہوں کہ ایسی مجلس کرنے سے نہ رُکیں اور اقوالِ بے جا منکروں کی طرف سے جو تعصب سے کہتے ہیں ہرگز التفات نہ کریں۔

اور جواز اس کا بہ خوبی ثابت ہے۔ اور قیام وقت ذکر میلاد کے چھ سو برس سے جمہور علماے صالحین نے، متکلمین اور صوفیۂ صافیہ اور علماے محدثین نے جائز رکھا ہے۔ اور صاحب رسالہ نے اچھی طرح ان امور کو ظاہر کیا ہے۔

اور تعجب ہے ان منکروں سے، ایسے بڑھے کہ فاکہانی مغربی کے مقلد ہو کر جمہور سلف صالح کو متکلمین اور محدثین اور صوفیہ سے ایک ہی لڑی میں پرو دیا اور ان کو ضال مضل بتایا۔

اور خدا سے نہ ڈرے کہ اس میں ان لوگوں کے استاد اور پیر بھی تھے۔ مثل حضرت شاہ عبد الرحیم دہلوی، اور ان کے صاحبزادے شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے صاحبزادے شاہ رفیع الدین دہلوی، اور ان کے بھائی شاہ عبد العزیز دہلوی، اور ان کے نواسے حضرت مولانا محمد اسحٰق دہلوی قدس اللہ اسرارہم۔ سب کے سب انھیں ضال مضل میں داخل ہوئے جاتے ہیں۔

اُف! ایسی تیزی پر، کہ جس کے موافق جمہور متکلمین اور محدثین اور صوفیہ سے حرمین اور مصر اور شام اور یمن اور دیار عجم میں لاکھوں گمراہی میں ہوں۔ اور یہ حضراتِ چند ہدایت پر۔ اللہ ہمیں اور ان کو ہدایت کر۔ اور سیدھے رستے پر چلا۔ امین ثم امین۔ الخ (ص ۴۲۱۔ نور چہارم۔ انوار ساطعہ دربیان مولود وفاتحہ۔ مرتبہ مولانا عبد السمیع بیدل رام پوری سہارن پوری۔ طبع چہارم مبارک پور ضلع اعظم گڑھ ۱۴۲۸ھ/ ۲۰۰۷ء)

اور ماقی اہل کورٹ کو سکوت ہوتو ہر ایک اہل کورٹ اپنی رائے علیحدہ لکھے۔ بعد ملاحظہ موافق قاعدہ آٹھویں (۸) کے غلبۂ آراء پر عمل ہوگا اور بعد منظوری ہر ایک سررشتہ کے سکریٹر کے پاس بھیجی جائے۔

(۱۱) ہر ایک سررشتۂ فوج کے جو اشخاص حسب قاعدہ دوسرے کے منتخب کیے جاویں گے وہی اشخاص اس سررشتہ کے منتظم اور منصرم مقرر کیے جاویں اور ان کے تحت میں چار آدمی کی کمیٹی حسبِ طریقہ قاعدہ چوتھے (۴) کے قرار پاوے اور بقدر ضرورت اسے اس کمیٹی میں بھی سکریٹر مقرر رہوں۔ اور جو رائے اس کمیٹی میں غلبہ آرا سے مرتب ہوئے وہ رائے بذریعہ ان شخصوں افسر کمیٹی کے کورٹ میں پیش کی جاوے اور کورٹ سے موافق قاعدہ ساتویں (۷) کے عمل میں آوے۔ اور یہی طریقہ ہر ایک سررشتہ فوجی اور ملکی میں مرعی کیا جاوے۔

(۱۲) ہر وقت بمقتضائے مصلحت کورٹ کو اصلاح اور ترمیم قواعد دستور العمل ہذا کا غلبہ آرا سے اختیار دیا جاوے۔''

....

(منقول از عکس مطبوعہ مقابل ص ۱۸۲ ''بہادر شاہ دوم'' از ڈاکٹر مہدی حسین (نیز ڈاکٹر سین کی ''۱۸۵۷ء'' کے مقابل ص ۴۷۔ اور میوٹنی پیپر کے ص ۳۶۔ بکس نمبر ۱۴۱۔ ۵۳۹ـ۵۴۱)

(ص ۹۵ تا ۹۹۔ فضل حق اور ۱۸۵۷ء۔ مولفہ محمود احمد برکاتی ٹونکی)

☆☆☆☆☆☆☆

سیاسی بصیرت واستقامت اور انقلاب ۱۸۵۷ء

مولانا محمد عبدالشاہد شیروانی علی گڑھی

علامہ فضل حق خیر آبادی نے حادثۂ بالاکوٹ (۱۸۳۱ء) اور واقعۂ ہنومان گڑھی (۱۸۵۵ء) دیدۂ عبرت سے دیکھا۔ اکبر شاہ ثانی، اور بہادر شاہ ظفر کی بے بسی اور پھر واجد علی شاہ اختر والی اودھ کی معزولی (۱۸۵۶ء) و بے کسی کی علت پر نظر جمائی۔ دہلی اور لکھنؤ کے ان حالات سے ایک حق آگاہ وحساس انسان کو اثر پذیر ہونا ہی چاہیے تھا۔

دوسری طرف عمالِ حکومت ہندوستانی تہذیب و کلچر اور ہندوستانیوں کے مذہب کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ تبلیغ عیسویت کا ڈنکا بجنے لگا تھا۔ عیسائی مشنریاں، مدارس، ہسپتال، اور دوسرے پبلک اداروں سے مذہبی اشاعت اپنا فرض منصبی سمجھ رہی تھیں۔ ان کی دریدہ دہنی کا شکار مقامی مذاہب بن رہے تھے۔ مذہب اسلام پر خصوصیت سے نظرِ توجہ تھی۔ پادری فنڈر اور مولوی رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی وغیر ہم کے مناظروں (۱۸۵۴ء) سے ہل چل مچی ہوئی تھی۔

عوام کو خیال ہونے لگا تھا کہ حکومت تو گئی ہے اب مذہب پر بھی ہاتھ صاف کیا جا رہا ہے۔ ہندوستانیوں کی اصل متاع مذہب ہی ہے۔ یہ تمام نقصان اور مصیبتیں برداشت کر سکتا ہے لیکن مذہب پر آنچ نہیں آنے دیتا۔

سرسید احمد خاں ''اسباب بغاوتِ ہندوستان'' میں لکھتے ہیں:

> ''۱۸۵۵ء میں کلکتہ سے پادری صاحبان ای ایڈمنڈ نے تمام سرکاری ہندوستانی عہدیداروں کے نام گشتی چھٹی بھیجی تھی کہ:
>
> ''برٹش راج میں تمام ہندوستان میں ایک عملداری ہوگئی ہے۔ تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہوگئی۔ ریلوے، سڑک سے سب جگہ کی آمد و رفت ایک ہوگئی۔ مذہب بھی ایک چاہیے۔ اس لئے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہو جاؤ''

علامہ فضل حق کا بچپن، جوانی اور کہولت دہلی میں گذرے۔ آخر میں لکھنؤ پہنچے۔ وہاں کی

حالت دہلی سے بھی بدتر پائی۔ بادشاہ دہلی اور والی اودھ برائے نام حکمران تھے۔ آخر الذکر نے تو لٹیا ہی ڈبو دی تھی۔ مسجد ہنومان گڑھی شہید ہوئی۔ مسلمان مجاہدین کفار کے ہاتھوں خاک وخون میں لتھڑے۔ امیر علی شاہ توپ دم ہوئے۔ مجاہدین سرکاری فوج کے ہاتھوں کشتہ ہوئے۔ ناموسِ اسلام کی بے عزتی اور اسلامی شعائر کی بربادی پر بھی واجد علی شاہ کو عیش وعشرت کی پڑی تھی۔ علامہ صدر الصدور تھے۔ ان واقعات سے متاثر ہو کر لکھنؤ چھوڑ کر ۱۸۵۶ء میں الور چلے گئے مگر دل بے چین رہا کہ اتنے میں کچھ شورش اٹھتی نظر آئی۔ دربار دہلی سے راجاؤں کے نام خطوط بھی روانہ ہوئے۔ علامہ نے راجہ الور سے بھی گفتگوئیں کیں۔ وہ رام نہ ہوا۔ وہاں سے چل کھڑے ہوئے۔ راہ میں زمینداروں کو تلقین کرتے ہوئے چلے۔ اس سے قبل مولوی احمد اللہ شاہ دلاور جنگ مدراسی سے سرگوشیاں ہو چکی تھیں۔ دلاور جنگ فیض آباد چلے گئے تھے اور ہنگامہ ہوتے ہی لکھنؤ آکر قابض ہو گئے۔

شاہ اودھ کی معزولی، بادشاہِ دلی کی نام نہاد خطابات سے منصوبہ محرومی اور مذہب عیسوی کی بہ جبر نشر واشاعت نے فرنگیوں کو بالکل بے نقاب کر دیا تھا۔

کارتوسوں کی چربی سے دل کا غبار آتش فشاں بن کر پھوٹ پڑا۔ اس نے بارود پر فلیتہ کا کام دیا۔ لکھنؤ میں ۱۲/ ذیقعدہ ۱۲۷۳ھ مطابق ۵/ جولائی ۱۸۵۷ء بروز یکشنبہ مرزا رمضان علی عرف برجیس قدر بن واجد علی شاہ کو بیگم حضرت محل کی منظوری سے ممو خاں کی سرکردگی میں فوجی سالاروں نے باقاعدہ تخت نشیں کر دیا۔ (قیصر التواریخ جلد دوم۔ ص ۲۲۵۔ مصنفہ میر محمد زائر)

احمد اللہ شاہ (مدراسی دلاور جنگ) پہلے قابض ہو کر شہر کا بندوبست کر چکے تھے۔ اب تلنگے جابجا متعین ہوئے۔ شاہ جی سخت سست کہہ کر چپ ہو گئے۔ بیلی گارڈ پر انگریزوں سے چھ روز تک لڑائی ہوتی رہی۔ ۱۰/ جولائی کی شام کو جمعہ کے دن پسپا ہو کر ہٹ آئے۔ (قیصر التواریخ جلد دوم۔ ص ۲۳۰۔)

علامہ الور سے نشر واشاعت کرتے ہوئے مئی ۱۸۵۷ء میں دہلی پہنچے۔ میرٹھ اور دوسری چھاؤنیوں میں کارتوسوں کا قضیہ زور پکڑ چکا تھا۔ گائے اور سور کی چربی کی آمیزش کی خبر سے ہندو اور مسلمان فوجی بگڑ بیٹھے تھے۔ روٹی کی ٹکیا کی تقسیم کسی خاص اسکیم کے ماتحت گاؤں گاؤں پہلے سے ہو ہی ہو چکی تھی۔

میرٹھ سے دہلی پر "باغی" فوج نے ۱۱/ مئی ۱۸۵۷ء کو حملہ کر دیا۔ قتل وغارت گری کا بازار گرم ہوا۔ بادشاہِ دہلی سرگرمیوں کا مرکز بنے۔ علامہ بھی شریک مشورہ رہے۔ منشی جیون لال اپنے

روزنامچہ میں لکھتے ہیں:

۱۶ راگست ۱۸۵۷ء: مولوی فضل حق شریک دربار ہوئے۔ انھوں نے اشرفی نذر میں پیش کی اور صورتِ حالات کے متعلق بادشاہ سے گفتگو کی۔

۲ ر ستمبر ۱۸۵۷ء: بادشاہ دربار عام میں تشریف فرما ہوئے۔ مرزا الٰہی بخش، مولوی فضل حق، میر سعید علی خاں اور حکیم عبدالحق آداب بجالائے۔

۶ ر ستمبر ۱۸۵۷ء: مولوی فضل حق نے اطلاع دی کہ متھرا کی فوج آگرہ چلی گئی ہے۔ اور انگریزوں کو شکست دینے کے بعد شہر پر حملہ کر رہی ہے۔

۷ ر ستمبر ۱۸۵۷ء: بادشاہ دربار خاص میں رہے۔ حکیم عبدالحق، میر سعید علی خاں، مولوی فضل حق، بدرالدین خاں، اور دیگر تمام امرا ورؤسا شریک دربار رہے۔ (غدر کی صبح و شام۔ روزنامچہ منشی جیون لال۔ ص ۲۱۷، ۲۴۰، ۲۴۶، ۲۴۷)

اس روزنامچہ سے علامہ کی باخبری اور انقلابی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ موجودہ صورت حالات کے متعلق بادشاہ سے گفتگو کی۔ بادشاہ سراسیمہ تھے۔ شہزادوں کی لوٹ کھسوٹ اور تخت شاہی کی تمناؤں نے باہمی رقابت کا میدان گرم کر رکھا تھا۔ عمائد شہر میں دو گروہ تھے۔ ایک بادشاہ کا ہمنوا اور دوسرا حکومت کمپنی کا بہی خواہ۔ فوجیوں میں طمع اور لالچ نے گھر کر لیا تھا۔ دو ایک جماعتیں مقصدِ اعلیٰ کو سامنے رکھے ہوئے تھیں۔ ایک جماعت مجاہدین کی تھی۔ دوسری روہیلوں کی۔ یہ جنرل بخت خاں کی سرداری میں دادِ شجاعت دے رہی تھی۔

علامہ سے جنرل بخت خاں ملنے پہونچے۔ مشورہ کے بعد علامہ نے آخری تیر ترکش سے نکالا۔ بعد نماز جمعہ جامع مسجد میں علما کے سامنے تقریر کی۔ استفتا پیش کیا۔ مفتی صدرالدین خاں آزردہ صدر الصدور دہلی، مولوی عبدالقادر، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبرآبادی، سید مبارک شاہ رام پوری نے دستخط کر دیے۔ اس فتویٰ کے شائع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی۔ دہلی میں نوے ہزار سپاہ جمع ہو گئی تھی۔ (تاریخ ذکاءاللہ)

جنرل بخت خاں کی اسکیموں میں مرزا مغل آڑے آتے تھے۔ مرزا الٰہی بخش نے بادشاہ سے سرکار میں معافی کا خط بھی بھجوا دیا تھا۔ کوئی سنوائی نہ ہوئی۔ مرزا مغل کی وجہ سے فوج میں پھوٹ پڑ گئی۔ جنرل بخت خاں سے لوگ بگڑ گئے۔ کمپنی کی فوج نے ۱۴ ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو شہر دہلی پر حملہ

کر دیا۔ اور ۱۹ر ستمبر کو مکمل طور پر انگریز قابض ہو گئے۔

بادشاہ جو اس درمیان میں قلعہ سے نکل کر مقبرۂ ہمایوں میں پناہ گزیں ہو چکے تھے مع متعلقین گرفتار کر کے قلعہ میں نظر بند کر دیئے گئے۔ تین شاہزادوں کو گولی کا نشانہ بنایا گیا اور ان کے سروں کو خوان پوش سے ڈھک کر خوان میں لگا کر بادشاہ کے سامنے بطور تحفہ پیش کیا گیا۔ انھیں میں مرزا مغل بھی تھے۔ جنرل بخت خاں اپنی فوج اور توپ خانہ کو نکال لے گئے۔ بادشاہ سے کہا! آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔ مگر وہ زینت محل اور مرزا الٰہی بخش کے ہاتھ میں کھلونا بن چکے تھے، آمادہ نہ ہوئے۔ جنرل بخت خاں، ڈاکٹر وزیر خاں، مولوی فیض احمد وغیرہم سب لکھنؤ چلے گئے۔

یہ سب لوگ لکھنؤ پہنچ کر احمد اللہ شاہ دلاور جنگ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔ خوب خوب مقابلے رہے۔ بالآخر شکست کھا کر شاہجہاں پور روانہ ہو گئے۔ محمدی (شاہجہاں پور) میں اسلامی حکومت قائم کر لی گئی۔ نانا صاحب پیشوا، مولوی عظیم اللہ کان پوری، شہزادہ فیروز شاہ وغیرہم سب یہیں جمع ہو گئے۔ آخری جنگ انگریزوں سے شاہجہاں پور میں ہوئی۔ یہاں بھی شکست کا منھ دیکھنا پڑا اور یہ سب لوگ نیپال چلے گئے۔ دلاور جنگ کو راجہ پوائیں بلدیو سنگھ نے دعوت کے بہانے سے بلا کر دھوکہ سے ۱۵ر جون ۱۸۵۸ء مطابق ۲ر ذیقعدہ ۱۲۷۴ھ کو شہید کر دیا۔ دریا پار محلّہ جہان آباد، متصل احمد پورہ مسجد کے پہلو میں سر دفن ہوا۔

علامہ دہلی سے ۲۴ر ستمبر کو روانہ ہو گئے۔ علامہ نے الثورۃ الہندیہ میں لکھا ہے کہ "انگریزوں کے قبضے کے بعد پانچ دن تک بھوکے، پیاسے مکان کے اندر بند رہے۔ پانچویں روز اہل وعیال اور ضروری سامان لے کر شب میں چھپ کر نکلے، دریا عبور کیے، میدان قطع کیے۔

نواب صدر یار جنگ بہادر محمد حبیب الرحمٰن خاں شیروانی علی گڑھی صدر الصدور حیدر آباد دکن (متولد ۲۸ر شعبان ۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶۶ء۔ متوفی ۲۶ر شوال ۱۳۶۹ھ/ ۱۱راگست ۱۹۵۰ء بروز جمعہ بعمر ۸۶ سال) کا بیان ہے کہ علامہ مع متعلقین بھیکن پور ضلع علی گڑھ آ کر ۱۸ر روز رہے۔ صاحبزادہ مولانا عبدالحق بھی ساتھ تھے۔ اٹھارہ روز کے بعد عم محترم نواب عبدالشکور خاں رئیس بھیکن پور نے سانکرہ کے گھاٹ سے جو بھیکن پور سے آٹھ میل دور، اور موصوف کے عزیزوں کی عملداری میں واقع تھا۔ اپنے انتظام سے بدایوں اور بریلی کی طرف اتروایا تھا۔ نواب صدر یار جنگ بہادر نے مجھے وہ کمرہ بھی بتایا جس میں علامہ فروکش ہوئے تھے۔ گڑھی میں برج پر جانب

مشرق واقع تھا۔ (۱۹۴۷ء کے بعد پوری گڑھی ویران ہوچکی ہے) نواب صدر یار جنگ ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے۔ علامہ کے ورود بھیکن پور (علی گڑھ) کے ۹ رسال بعد بچپن میں والد ماجد اور عم محترم سے یہ واقعات سُنے اور فطرت خداداد کی بنا پر انھیں یاد رکھا۔

موصوف نے یہ بھی بیان کیا کہ والد ماجد (محمد تقی خاں) اور مولانا عبدالحق میں کافی تعلقات بھی ہوگئے جو بعد میں خط و کتابت کی شکل میں جاری رہے۔ موصوف ہی کی یہ بھی روایت ہے کہ علامہ، صاحبزادہ کو سبق پڑھاتے رہے۔ بھیکن پور نواب صدر یار جنگ بہادر اور راقم السطور کا مولد و منشأ طفولیت بھی ہے۔

اس طرح ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی اور ۱۷۹۹ء کی جنگ میسور کی طرح ۱۸۵۷ء کی یہ جنگ آزادی بھی ہندوستانیوں کی شکست اور انگریزوں کی فتح پر ختم ہوئی۔

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میرؔ
مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا

۱۹ ستمبر (۱۸۵۷ء) کے بعد ہندوستانیوں پر جو مصائب کے پہاڑ ٹوٹے اس کی نظیر تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ یوں تو دہلی نے بہت سے ہنگامے دیکھے تھے۔ نادر شاہ درانی کا ایام عیدالاضحیٰ میں قربانی کے جانوروں کی جگہ انسانوں کا ذبح عام اور شہر کی نالیوں میں پانی کے بجائے خون کی روانی دیکھی تھی۔ ''ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت'' کے مطابق شہر کا اجڑنا اور دوسری جگہ آباد ہونا، دارالسلطنت پر حملہ آوری، اور'' ان الملوك اذا دخلوا قرية افسدوها و جعلوا اعزة اهلها اذلة۔" کے بموجب شرفا کی ذلت وخواری بھی نظر سے گذری تھی۔

مگر ایسے مظالم!

لاعين رأت و لااذن سمعت و لاخطر على قلب بشر"
نہ آنکھوں نے دیکھے، نہ کانوں نے سنے۔ نہ انسان کے دل میں کبھی ان کا خطرہ بھی گذرا۔ الامان و الحفیظ۔

سرکنم گریہ اگر تاب شنیدن داری
سینہ بشگافم اگر طاقتِ دیدن داری

ان مظالم کو لکھتے ہوئے دل لرزتا ہے۔ سینۂ قلم شق اور جگر قرطاس پارہ پارہ ہوا جاتا ہے۔

انتقام کی کوئی حد ہوتی ہے۔اگر ہندوستانی فوجیوں نے مذہبی جوش اور ملکی جذبے میں مجنون بن کر اپنی جہالت وحماقت سے کچھ یورپین بچوں اور عورتوں کو قتل کرڈالا تھا تو یہ کوئی نئی چیز نہ تھی۔عوام جوش میں آکر ہمیشہ اسی قسم کی حرکتیں کرتے رہے ہیں۔

۱۸۵۷ء میں انگریز جیسی دعویدارِ تمدن وتہذیب قوم نے یہ شرمناک اور انسانیت سوز حرکات جوش میں نہیں، ہوش میں کیں۔غلامی کی لعنت سے متأثر ہوکر نہیں، فاتح وقابض ہونے کے بعد کیں۔جہالت وحماقت سے نہیں، بزعم خود دانشمندی وفرزانگی کے ماتحت کیں۔غفلت ونادانستگی سے نہیں بلکہ قصداً اور دانستہ کیں۔خصوصیت سے مسلمانوں کے ساتھ جو ذلّت آمیز اور جگر خراش برتاؤ کیا وہ بیان سے باہر ہے۔

زندہ مسلمانوں کو سور کی کھال میں سلوا کر گرم تیل کے کڑھاؤ میں ڈلوانا، سکھ رجمنٹ سے علیٰ رؤس الاشہاد اغلام کرانا، فتح پوری مسجد سے قلعہ کے دروازے تک درختوں کی شاخوں پر مسلمانوں کی لاشوں کا لٹکانا، مساجد کی بے حرمتی خصوصاً شاہجہانی جامع مسجد دہلی کے حجروں میں گھوڑوں کا باندھنا، عبادت کی جگہ دفاتر قائم کرنا اور حوض میں وضو کے پانی کی جگہ گھوڑوں کی لید ڈالنا، ناقابل معافی اور غیر ممکن التلافی جرم ہے۔

منصف مزاج انگریز بھی اس کی مذمت کیے بغیر نہ رہ سکے۔تفصیل کے لئے دیکھیے۔"انقلاب ۱۸۵۷ء کا دوسرا رخ" مترجمہ شیخ حسام الدین بی۔اے امرتسری سابق صدر مجلس احرار اسلام ہند۔

تاریخ عالم شاہد ہے کہ مسلمان قوم کو بھی فتح وظفر کے ایسے مواقع پیش آئے ہیں لیکن ان کا دشمنوں کے ساتھ کیا سلوک رہا۔اپنوں کا نہیں غیروں کا بیان سنیے۔دوستوں کی نہیں دشمنوں کی تحریریں دیکھیے۔

کون نہیں جانتا کہ چودہ سو سال قبل ۸ھ میں جب مکہ فتح ہوا! تو خدا کے آخری برگزیدہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دشمنوں کے ساتھ کیا طرزِ عمل اختیار فرمایا جنھوں نے ذلّت ورسوائی اور مصائب وآلام پہنچانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔تالیاں بجائی تھیں۔پتھر مارے تھے۔دھول اڑائی تھی۔آوازے کسے تھے۔سحری، سودائی، مجنوں اور دیوانہ خطابات دیئے تھے۔راستے میں کانٹے بچھائے تھے۔پشت پر اونٹ کا بوجھ لادا تھا۔گردن میں چادر کا پھندا ڈال کر کھینچا تھا۔قتل کے منصوبے باندھے تھے۔اور سب سے آخر یہ کہ وطن سے نکال کر بے گھر اور بے در بنایا

تھا۔ اس شاہِ دوجہاں نے فتح کے بعد اعلان کیا: جو ہتھیار رکھ دے اسے امان۔ جو معابد میں مشغول عبادت ہو وہ محفوظ۔ جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے وہ مامون۔

جب دشمنوں کا سامنا ہوتا ہے تو دریافت فرماتے ہیں کہ مجھ سے کیا توقع رکھتے ہو؟

یک زبان ہو کر کہتے ہیں۔ شریف بھائی اور شریف بھتیجے سے جو توقع ہو سکتی ہے وہی ہم بھی رکھتے ہیں۔

جواب ملتا ہے! جاؤ تم سب آزاد ہو۔

کئی سو سال کے بعد اسی قسم کا واقعہ اس شاہِ دوسرا کے ادنیٰ غلام سلطان صلاح الدین ایوبی کو بیت المقدس میں پیش آتا ہے۔ اس خطۂ پاک (فلسطین) پر خلیفۂ دوم حضرت امیر المؤمنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خود بہ نفس نفیس صلح و آشتی کے ساتھ قبضہ فرمایا تھا۔ اس وقت سے تقریباً ساڑھے چار سو سال تک پرچم اسلام لہراتا رہا۔ ۱۰۹۹ء عیسوی میں عیسائیوں نے اس پر تسلط قائم کر لیا۔ مگر کس شان سے؟ ایک انگریز مؤرخ ہی کے قلم کے رشحات دیکھیے:

> "جب گوڈفرے اور تنکرد، یروشلم کے کوچہ و بازار میں گذرے تھے تو وہاں مردے پڑے اور جاں بہ لب زخمی لوٹتے تھے۔ جبکہ بے گناہ اور لاچار مسلمانوں کو، ان صلیبیوں نے سخت اذیتیں دے کر مارا تھا اور زندہ آدمیوں کو جلایا تھا۔ جہاں قدس کی چھتوں اور برجوں پر جو مسلمان پناہ لینے چڑھے تھے وہیں ان صلیبیوں نے اپنے تیروں سے چھید کر گرایا تھا۔" (اردو ترجمہ سلطان صلاح الدین ایوبی۔ ص ۲۰۲۔ مصنفہ انگریز مؤرخ سٹیلے لین پول)

۹۰ برس کے بعد ۲۶ ستمبر ۱۱۸۷ء مطابق ۲۷ رجب ۵۸۲ھ کو سلطان نے فوج کشی کر کے اور شاہ رچرڈ وغیرہ سے لڑائیاں لڑ کر فلسطین پر علم اسلام لہرا دیا۔ مدتوں کی جنگ کے بعد اس عظیم الشان فتح پر اعلان عام کر دیا کہ دس اشرفی زرِ فدیہ دے کر ہر عیسائی اپنا ساز و سامان لے کر امن و امان کے ساتھ شہر چھوڑ سکتا ہے۔ چالیس دن کی مہلت بھی دی گئی۔

جو لوگ غریب تھے ان میں سے سات ہزار کو شاہِ انگلستان کی رقم سے فدیہ ادا کر کے رہا کرایا گیا۔ کوکبری نے شہر الرہا کے ایک ہزار آرمینیوں کو فدیہ دے کر آزاد کرایا۔ برادر سلطان ملک العادل نے شاہ رچرڈ کی دوستی کی بنا پر سلطان سے ایک ہزار غلام مانگ کر اپنی طرف سے آزاد کر دیئے۔ بطریق اعظم اور بلیان سفیر نے بھی جرأت کر کے سلطان سے ملک العادل کے برابر غلام

مانگے جو اجازت ملنے پر آزاد کردیئے گئے۔ باقی ماندہ عیسائیوں کو سلطان نے اپنی طرف سے آزاد کردیا۔ امرا اور شہسواروں کی بہو بیٹیوں نے فریاد کی کہ ہمارے شوہر اور سرپرست یا تو مارے گئے یا قید و بند میں ہیں۔ ہماری دستگیری کی جائے۔ سلطان نے ان کی آہ وزاری سے متأثر ہوکر قیدیوں کو رہا کیا۔ اور جو مارے گئے تھے ان کے پسماندگان کو خزانے سے اس قدر روپیہ دلایا کہ سب مطمئن اور خوش خوش واپس گئیں۔ (ایضاً۔ص ۲۰۲ تا ۲۰۵)

یہ تھا مسلمانوں کا انتقام! اور یہ تھی بدترین دشمنوں کے ساتھ رواداری!

''غیر متمدن'' دنیا کے ان تاریخی حقائق کے بعد دورِ تہذیب وتمدن کے علَم بردار یورپ کے ان کرتوتوں پر کون انصاف پسند انسان شرم سے گردن نہ جھکالے گا؟

علماو امرا و خواص وعوام کی تباہی و بربادی کی داستان بڑی طویل ہے۔ قابل ذکر کچھ نام درج کیے جاتے ہیں:

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد پھانسی پانے والے یا گولیوں سے اڑائے جانے والے

(۱) نواب عبدالرحمٰن خاں والی جھجھر (مع ضبطی جائداد)

(۲) راجہ نا ہر سنگھ رئیس بلب گڑھ

(۳) نواب مظفر الدولہ

(۴) نواب میر خاں پنشن دار و جاگیردار پلول

(۵) نواب اکبر خاں بن فیض اللہ خاں بنگش

(۶) احمد مرزا

(۷) میر محمد حسین

(۸) حکیم عبدالحق بن حکیم بخش

(۹) قاضی فیض اللہ کشمیری سررشتہ دار صدر الصدور

(۱۰) میر پنجہ کش، مشہور خوش نویس

(۱۱) نواب محمد حسین خاں

(۱۲) مشہور شاعر مولوی امام بخش صہبائی

(۱۳) نواب احمد قلی خاں (جیل میں موت واقع ہوگئی)

(۱۴) نظام الدین خاں بن حکیم شرف الدین

(۱۵) خلیفہ اسمٰعیل خلف استاد ذوقؔ

(۱۶) محمد علی خاں خلف نواب شیر جنگ خاں

(۱۷) عبدالصمد خاں بن علی محمد خاں رسالہ دار شاہی فوج

(۱۸) دلدار علی خاں کپتان

(۱۹) میاں حسن عسکری صوفی

(۲۰) غلام محمد خاں عم نواب احمد علی خاں رئیس فرخ نگر

دہلی چھوڑ کر غریب الوطنی کی زندگی بسر کرنے والے

(۱) میاں غلام نظام الدین
(۲) نواب غلام محی الدین خاں پنشن دار
(۳) حکیم محمود خاں والدِ مسیح الملک حکیم اجمل خاں
(۴) حکیم مرتضیٰ خاں
(۵) نواب یعقوب علی خاں (گوجروں نے لوٹ کر قتل کر ڈالا)
(۶) مرزا فاضل بیگ
(۷) عبدالحلیم خاں نائب کوتوال (مع ضبطی جائداد)
(۸) منشی آغا جان محرر اکتبٹی
(۹) صفدر سلطان بخشی
(۱۰) نواب سید حامد علی خاں رئیس برست
(۱۱) مرزا معین الدین خاں، تھانیدار پہاڑ گنج
(۱۲) محمد حسین خاں تھانیدار بدر پور
(۱۳) لالہ رام جی داس گڑ والے
(۱۴) ضیاء الدولہ خلف حکیم رکن الدولہ
(۱۵) موسیٰ خاں بن حافظ عبدالرحمٰن خاں مختار مرزا نیلی۔
(۱۶) عبدالصمد خاں خسر نواب جھجر
(۱۷) حکیم امام الدین خاں بن حکیم غلام رضا خاں
(۱۸) نواب حسن علی خاں برادر نواب جھجر
(۱۹) سعادت علی خاں خلف حسن علی خاں
(۲۰) میر نواب نائب کپتان
(۲۱) نواب عبدالرحمٰن خاں
(۲۲) نواب علی محمد خاں عم والی جھجر
(۲۳) راجہ اجیت سنگھ عم راجہ نربندر سنگھ رئیس پٹیالہ
(۲۴) غلام فخر الدین خاں، تحصیلدار کوٹ قاسم

ان کے علاوہ حیدر خاں اور اشرف خاں مخبران نے ایک سو سات نوجوانوں کو الور سے گرفتار کرا کے دہلی بھیجا۔ آدھے گوڑگاؤں میں قتل کر دیے گئے۔ باقی کو دہلی میں پھانسی دی گئی۔ اسی طرح کے بیسیوں حادثات ہیں۔ کہاں تک بیان کیے جائیں۔

مفتی صدر الدین خاں آزردہ صدر الصدور دہلی، مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ وغیرہم بھی دھر لیے گئے۔ ان اکابر کو بڑی دشواریوں کے بعد نجات مل سکی۔ پنشنوں اور جاگیروں پر زد پھر بھی باقی رہی۔

سید اسمٰعیل حسین منیرؔ شکوہ آبادی، مولانا مفتی عنایت احمد کاکوروی، مفتی مظہر کریم دریابادی وغیرہم کو بجرم بغاوت کالے پانی کی سزا ہوئی۔

علامہ فضلِ حق کو بھی ''باغی'' قرار دیا گیا۔ اسیر فرنگ ہو کر بند ہوئے۔ ۱۲۷۵ھ مطابق ۱۸۵۹ء میں لکھنؤ میں مقدمہ چلا۔ ظاہر ہو رہا تھا کہ مولانا بری ہو جائیں گے۔ چنانچہ پیروکار مقدمہ منشی کرم احمد خیر آبادی نے لکھنؤ سے سید اعظم علی کے نام خیر آباد یہ خط لکھا:

''مدت یک دو روز است کہ جناب مخدوم الاخوان بحسب تقدیر مبتلائے حبس شدہ از سیتاپور بہ لکھنؤ برائے روبکاری صفائی روانہ کردہ شدہ اند۔ زبانی آیندہ ہرگاہی ہم از تحریرات آنجا ہر روز منکشف می شود کہ درامروز فردا بفضلہ تعالیٰ رہائی خواہد شد۔

روز بنا برادائے شہادت صفائی، مولوی صاحب مکرم، مولوی نبی بخش صاحب، مشفقی مولوی قادر بخش صاحب و برخوردار مولوی سید ضامن حسین، بموجب درخواست مولوی عبدالحق (خلفِ علامہ) بمعیت ایشاں روانہ لکھنؤ شدہ اند، و ہمگیاں را امید از خدائے کریم است۔ دیگر روز بالضرور مخلصی یافتہ، وارد دولت خانہ خواہد شد۔ اوتعالیٰ ہم چنیں کند۔ ہمہ ہا از خورد و کلاں و ذکور و اناث چشم براہ انتظار کشادہ می باشند۔ و رنج و قلقے عظیم دارند۔ ایزد جل وعلا بر جمیع کساں رحم خود فرماید۔''

دوسرے روز عدالت نے حبس دوام بعبور دریائے شور کا حکم سنایا۔ خط مذکور میں اس کا ذکر اس طرح ہے:

''برادر من تا دہ عشرہ بسبب عدم بہرسی حامل ایں لفافہ افتادہ ماند۔ حالیہ آدمی خاص مقرر کردہ فرستادہ می شد کہ جواب شافی باید۔ و حال پر ملال جناب مولوی (فضل حق) صاحب از لکھنو دریں عرصہ نوشتہ آمد۔ لائق گریستن و وایلا کردن است۔ یعنی حبس دوام از پیش گاہ حکم صدور یافت۔ فواویلا و واحسرتا۔ اوتعالیٰ رحم فرماید۔''

محررہ بستم فروری مطابق ۱۷ر رجب ۱۲۷۵ھ

(سیر العلماء)

آخرش جزیرۂ انڈمان روانہ کر دیے گئے۔ ادھر مولانا عبدالحق اور مولوی شمس الحق نے علامہ کے قریبی عزیز خان بہادر مفتی انعام اللہ خاں شہابی گوپاموی کے داماد خواجہ غلام غوث خاں بہادر ذوالقدر میر منشی لفٹیننٹ مغربی و شمالی کی معاونت سے اپیل دائر کر دی۔

مرزا غالب، یوسف مرزا کو لکھتے ہیں:

''مولانا (فضل حق) کا حال کچھ تم سے مجھ کو معلوم ہوا۔ کچھ مجھ سے تم معلوم کرو۔ مرافعہ حکم دوام حبس بحال رہا بلکہ تاکید ہوئی کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کرو۔ چنانچہ تم کو معلوم ہو جائے گا۔ ان کا بیٹا ولایت میں اپیل کیا چاہتا ہے۔ کیا ہوتا ہے؟ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اِنا لِلّٰہ و انا الیہ راجعون۔

میاں داد خاں سیاح، سیر کرتے ہوئے کلکتہ پہنچے تو مرزا غالب نے انھیں لکھا:

''ہاں خاں صاحب! آپ جو کلکتہ پہنچے ہو اور سب صاحبوں سے ملے ہو تو مولوی فضل حق کا حال اچھی طرح دریافت کر کے مجھ کو لکھو کہ اس نے رہائی کیوں نہ پائی؟ وہاں جزیرہ میں اس کا کیا حال ہے؟ گذارہ کس طرح ہوتا ہے۔'' (اردوئے معلیٰ)

علامہ جزیرۂ انڈمان پہنچے۔ مفتی عنایت احمد کاکوروی صدر امین بریلی و کول، مفتی مظہر کریم دریابادی اور دوسرے مجاہد علما وہاں پہلے پہنچ چکے تھے۔ ان علما کی برکت سے یہ بدنام جزیرہ دارالعلوم بن گیا۔ ان حضرات نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ وہاں بھی قائم رکھا۔ خرابیِ آب و ہوا، تکالیف شاقہ، اور جدائیِ احبا و اعزہ کے باوجود علمی مشاغل جاری رہے۔

مفتی (عنایت احمد) صاحب نے ''علم الصیغہ'' جیسی صَرف کی مفید کتاب جو آج تک داخل نصاب ہے وہیں لکھی۔ سرکاری ڈاکٹر حکیم امیر خاں کی فرمائش سے ''تواریخ حبیب الٰہ'' (۱۲۷۵ھ) بھی تالیف کی۔ (یہی تاریخی نام بھی ہیں)

ان دونوں کتابوں کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان حضرات کے سینے علم کے سفینے بن گئے تھے۔ تاریخی یادداشت، ترتیبِ واقعات، قواعد فنون، ضوابط علوم سبھی حیرت انگیز کرشمے دکھا رہے ہیں۔ ایک انگریز کی فرمائش پر ''تقویم البلدان'' کا ترجمہ کیا جو دو برس میں ختم ہوا۔ اور وہی رہائی کا سبب بنا۔

واپسیِ ہندوستان پر شاگرد رشید مفتی لطف اللہ علی گڑھی نے تاریخ لکھ کر پیش کی:

چو بفضل خالقِ ارض و سما   اوستادم شدز قیدِ غم رہا
بہرِ تاریخ خلاصِ آں جناب   برنوشتم "اِنّ استاذی نجا"

۱۲۷۷ھ

(استاذ العلما مؤلفہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی)

مفتی مظہر کریم دریابادی نے میجر جان ہاٹن بہادر کمشنر جزائر دریائے شور کی فرمائش پر ''مراصد الاطلاع'' کا ترجمہ کیا۔ سید اسماعیل حسین منیرؔ شکوہ آبادی نے پانچ اشعار میں تاریخ لکھی۔ آخری شعر یہ ہے:

منیرؔ اس کی کہی تاریخ یوں سال مسیحی میں
یہی سیرِ جدیدِ بوستان ہفت کشور ہے
۱۸۶۶ء

(کلیات منیرؔ شکوہ آبادی)

علامہ فضل حق نے بھی کئی مفید تصانیف لکھیں۔ انھیں میں ''الثورۃ الہندیہ'' اور ''قصائد فتنۃ الہند'' ہیں۔ یہ رسالہ اور قصائد جہاں تاریخی ہیں وہیں عربی ادبیت کے بھی شاہکار ہیں۔ علامہ کا کمال یہ ہے کہ اشعار اور جملوں میں ایک مادّہ کے مختلف صیغے متعدد معنوں میں بے تکلف استعمال کرتے چلے جاتے ہیں۔ نظم و نثر دونوں اصناف میں اس کا ظہور برابر نظر آتا ہے۔ مثال کے لئے حسب ذیل عبارت و اشعار کافی ہیں۔

یہ رسالہ مع قصائد علامہ نے مفتی عنایت احمد کاکوروی کے ذریعہ ۱۲۷۷ھ میں خلف الصدق مولانا عبدالحق خیرآبادی کے پاس بھیجا تھا کہ ابن میاں کو جا کر یہ تحفہ دے دینا۔ پنسل اور کوئلہ سے لکھے ہوئے مختلف پرچے تھے جن کو کئی ماہ کی محنت کے بعد مولانا عبدالحق درست و مرتب کر پائے تھے:

الحمد للہ عظیم الرجاء☆ للانجاء من دون الارجاء☆ من البلوی و البلی و البلاء☆ وابلاء حسن البلاء☆ بایتاء الآلاء☆ لمن دعاہ باسنی الاسماء☆ لاسیما لمن ظلم و اضطر عندالابتلاء☆ بالاسواء و الادواء☆

ما ناح اورق فی اوراق اشجان　　اِلا وھیج اشجانی و اشجانی
دائی عضال ولایجدی لعائدۃ　　عود لداء لعود الداء عوّاد

علامہ اور ان کے ساتھیوں کو کیا تکالیف اٹھانی پڑیں اور انڈمان میں کیسے ذلّت آمیز برتاؤ سے سابقہ رہا، رسالہ و قصائد میں اس کا مفصل ذکر موجود ہے۔

سپرنٹنڈنٹ ایک شریف انگریز تھا۔ مشرقی علوم سے واقف اور فن ہیئت کا بڑا ماہر تھا۔ اس کی پیشی میں ایک سزا یافتہ مولوی بھی تھے۔ اپنی ایک فارسی کی کتاب ہیئت ان کو دی کہ اس کی عبارت صحیح و درست کر دیں۔ مولوی صاحب سے تو کام نہ چلا۔ علامہ نئے نئے گئے تھے ایک سال ہی گذرا تھا۔ ان کی خدمت میں وہ کتاب پیش کر کے تصحیح کی گذارش کی۔ علامہ نے نہ صرف عبارت درست کی بلکہ مباحث میں بہت کچھ اضافہ کر کے حاشیہ پر بہت سی کتب کے حوالے لکھ دیئے۔ جب یہ کتاب وہ مولوی صاحب سپرنٹنڈنٹ کے پاس لے گئے وہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا۔ کہنے لگا مولوی صاحب! ''تم بڑا لائق آدمی ہے مگر جن کتابوں کے حوالے ہیں اور ان کی جو عبارتیں نقل کی ہیں یہاں کہاں ہیں؟''

مولوی صاحب مسکرائے اور اصل واقعہ علامہ کا کہہ سنایا۔ وہ اسی وقت مولوی صاحب کو لے کر بیرک میں آیا۔ علامہ موجود نہ تھے۔ کچھ دیر انتظار کے بعد دیکھا کہ خستہ حالت میں چلے آرہے ہیں۔ وہ یہ ہیئت دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ معذرت کے بعد کلرکی میں لے لیا۔ گورنمنٹ میں سفارش بھی کی۔ ادھر علامہ کے صاحبزادے مولوی شمس الحق اور خواجہ غلام غوث بے خبر میر منشی لیفٹیننٹ مغربی و شمالی صوبہ اودھ سرگرم سعی تھے۔ مولوی شمس الحق انڈمان روانہ ہوگئے۔ وہاں جہاز سے اتر کے شہر میں گئے تو ایک جنازہ نظر پڑا۔ اس کے ساتھ بڑی تعداد میں لوگ تھے:

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کل ۱۲/ صفر ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء کو علامہ فضل حق خیرآبادی کا انتقال ہوگیا ہے۔ اب سپرد خاک کرنے جا رہے ہیں۔ یہ بھی بصد حسرت و یاس شریک دفن ہوئے۔ اور بے نیلِ مَرام واپس لوٹے:

قسمت کی بدنصیبی! کہاں ٹوٹی ہے کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

افسوس! ہمیشہ کے لئے یہ آفتاب علم و عمل دیارِ غربت میں غروب ہوگیا۔ اب تک یہ مزار زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ اور آج بھی قبر بزبان حال کہہ رہی ہے:

تلک آثارنا تدل علینا فانظروا بعدنا الیٰ الآثار

علامہ کی قبر انڈمان کے ساؤتھ پوائنٹ (جسے عرف عام میں نمک بھٹہ کہتے ہیں) ایک بستی

میں ہے جس کا ایک سمندری کنارہ Ross جزیرہ سے قریب ہے۔ یہ وہ جزیرہ ہے جہاں علما وغیرہ کو جہاز سے اتارا جاتا تھا۔ علامہ کی قبر کے ساتھ مولوی لیاقت علی کی بھی قبر ہے جن کا ذکر تواریخ عجیب از جعفر تھانیسری میں ہے۔ اور غدر کے چند علما از مفتی انتظام اللہ شہابی میں ہے۔

مزار کے متعلق مندرجۂ ذیل مکتوب (15/6/1974) قابل توجہ ہے:

محترم جناب شیروانی صاحب خدمت میں آداب

یہ خط آپ کی خدمت میں جناب سلیم اللہ صاحب کے توسط سے ارسال کر رہا ہوں امید ہے کہ اس خط کو پڑھ کر آپ محظوظ ہوں گے۔ یوں تو میں آپ کے لئے انجان ہو سکتا ہوں لیکن آپ میرے لئے قطعی انجان نہیں۔ آپ سے غائبانہ تعارف لٹن لائبریری (علی گڑھ) کے زمانے سے ہی ہے۔ بدقسمتی میری کہ ذاتی طور پر آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ آپ کی کتاب ''باغی ہندوستان'' کو خرید کر پڑھنے کا شرف حاصل رہا۔ اور علماے دین کا رشتہ انڈمان کی سرزمین اور باشندوں سے جان کر ازحد مسرت ہوئی۔

کاش کہ پرانے لوگ بھی بہ حیات ہوتے تو آج آپ کے اس حوالہ کا جو عربی میں ہے اور جو علامہ فضل حق سے نسبت ہے کہ:

تلک آثارنا، تدل علینا
فانظروا بعدنا الی الآثار

اس کی تصدیق بھی ہو جاتی۔ تاہم اپنی کوششوں سے کچھ تحقیق کے بعد اور آپ کی تحریر کی امداد سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس مزار میں جو دو مقبرے ہیں ان میں سے پہلا فضل حق مرحوم کا ہے اور دوسرا مرحوم لیاقت علی صاحب کا ہے۔

مولوی لیاقت علی کا تذکرہ دو جگہوں سے دستیاب ہو سکا۔ لیکن بہت ہی مختصر جو نا کافی ہے۔ رسالہ ''آج کل'' کا جنگ آزادی نمبر جس میں نثار احمد فاروقی صاحب کا ایک مضمون ہے۔ جنرل بخت خاں کے عنوان سے

انھوں نے حضرت خواجہ حسن نظامی کی کتاب ''بہادر شاہ کا مقدمہ'' سے اقتباس لیا ہے۔ دوسرا مولوی جعفر تھانیسری صاحب کی اپنی خودنوشت سوانح حیات ''کالا پانی'' اور ''تواریخ عجیب'' میں ہے۔ میں نے لٹن لائبریری میں دوران طالب علمی دیکھی تھی۔اب تو یہ کتاب جمعیۃ العلما کے جنرل سکریٹری آل انڈیا تعلیمی بورڈ جناب وحید الدین قاسمی صاحب نے دوبارہ شائع کروا کر محترم خان بادشاہ عبدالغفار خاں کو ہندوستان آنے پر جمعیۃ کی طرف سے بطور ہدیہ پیش کی ہے۔

افسوس کہ دوسری جنگ عظیم میں جاپانیوں کے یہاں قابض ہوجانے اوران کی بالا دستیوں کی وجہ سے تمام پرانے ریکارڈ خاکستر ہو چکے ہیں۔اور تحقیق کے لئے کوئی کاغذ اور کارآمد ثبوت نہیں ملتے۔میں نے بھی انگریزی میں ایک مقالہ:

Two Targetten India Mufuy At Port Blair.

کے عنوان سے لکھا ہے۔

اس مقصد سے کہ دعویٰ اور غلط قیاس آرائیاں جواب تک اس مزار سے متعلق جو مرجع تھا وہ نئی صورت سے نئی تحقیق کی روشنی میں آجائے اور عوام الناس کو اس کی صحیح نوعیت کا پتہ چلے۔ زیادہ تر باتیں تو آپ کی کتاب ''باغی ہندوستان'' سے ہی ماخوذ ہیں۔ کاش کہ اور تفاصیل مل جاتیں۔ یہاں تو ایسی کوئی لائبریری بھی نہیں کہ جس سے استفادہ کیا جاتا اور سرکاری ذرائع بھی خاموش ہیں۔البتہ علی گڑھ یونیورسٹی لائبریری، یا پھر دہلی آرکائز Archives میں کچھ مزید باتیں شاید مل جائیں۔اب میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔

جناب سلیم اللہ صاحب بھی اتفاق سے تشریف لے آئے تھے۔اور مجھے آپ سے ملنے کے بعد یہ شرف رہا کہ ایک صبح میں آپ کو اس مزار کی زیارت کے لئے لے گیا۔ خراماں، خراماں سمندر کے کنارے ٹہلتے ہوئے ساؤتھ پوائنٹ جو عرف عام میں نمک بھٹہ کہلاتا ہے زیارت کے

لئے پہنچے۔ یہ مزار ساؤتھ پوائنٹ کی ایسی بستی میں واقع ہے، جس کا ایک سمندری کنارہ Ross جزیرہ سے قریب ہے۔ یہ وہی جزیرہ ہے جہاں پر اول اول مولویانِ طریقت جہاز سے لا کر اتارے جاتے تھے۔ ان میں سے بہت سے علما کا تذکرہ تواریخ عجیب میں مولوی جعفر تھانیسری مرحوم نے کیا ہے۔

سلیم اللہ صاحب کل جہاز سے روانہ ہو رہے ہیں۔ یہ میرے لئے باعث فخر ہے کہ آپ چند دن ساتھ رہے اور ہمیں اچھی اچھی باتوں سے نوازتے رہے۔ باقی آئندہ۔ خدا حافظ۔ نیاز مند سید شوکت علی (اپوزٹ نیتاجی کلب ہال، نزد جامع مسجد، پورٹ بلیئر، انڈمان، آئرلینڈ)

مولانا عبداللہ بلگرامی (شاگرد علامہ فضل حق) لکھتے ہیں:

"فادرج الفضل فی اثناء اکفانه و دفن العلم باند فانه"
(مقدمۂ ھدیۂ سعیدیہ)

فضل ان کے کفن میں مکفون اور علم ان کے ساتھ مدفون ہو گیا۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"تبحر فی العلوم العقلیة و النقلیة، و فاق علی المهرة الکملة بالنفس القدسیة حتی امتلأت الآفاق بصیت کماله، و شحنت الاقطار بفضله وجلاله۔ و کان الغالب علیه من العلوم المعقول، و من المنقولات العلوم الادبیة و الکلام و الاصول، اما المعقولات فرزق فیها نفسها قدسیة و ملکة ملکوتیة، کان یری الطالبین نظریاتها ببینانه الصافی کالمحسوسات المرئیة، و اما ارتجاله بالخطب و الاشعار العربیة مع التجنیس و الاشتقاق و حسن البراعة و الطباق، و غیرها من الصنائع الادبیة، فلم یخلق مثله فی البلاد، و لم یأت عدیله فیما افاد و اجاد۔" (مقدمۂ ھدیۂ سعیدیہ)

ترجمہ: علوم عقلیہ ونقلیہ کے تبحر اور ماہرین کاملین پر نفس قدسیہ کے باعث فائق تھے۔آپ کے کمال کی شہرت سارے زمانے میں پہنچی ہوئی تھی۔اور آپ کے فضل وکمال سے سارا آفاق گونج رہا تھا۔علوم میں فن معقول کا غلبہ تھا اور منقولات میں ادب، کلام، اور اصول پر توجہ خاص تھی۔ معقولات میں نفس قدسیہ اور ملکۂ ملکوتیہ حاصل تھا۔طلبہ ان کے بیان صافی کی وجہ سے نظریاتِ معقولات کو بالکل محسوس ومرئی پاتے تھے۔ خطبات و اشعار فی البدیہہ فرماتے تھے۔ تمام صنائع ادبیہ تجنیس، اشتقاق، حسن براعت اور صنعت طباق کا ارتجال کے باوجود پورا پورا مظاہرہ ہوتا تھا۔انھیں کمالات کے پیش نظر اپنے علم وفضل میں بے نظیر اور افادہ وحسن تلقین میں بے عدیل تھے۔“

مصائب کا خاتمہ علامہ کی ذات ہی پر نہیں ہوجاتا۔اولاد واحفاد کو بھی پریشانیوں کا سامنا رہا۔سب سے بڑی مصیبت ضبطیِ جائداد واملاک کی تھی۔علامہ بڑے امیر کبیر تھے۔دولت دنیا و دین دونوں سے بہرہ ور اور صاحب عزووقار تھے۔حکّام وقت، شاہزادگان عالی تبار، امراء ورؤساء اور صلحاء سبھی عزت کرتے تھے۔شاہانہ زندگی گذاری۔ ہاتھی، گھوڑے، پالکی، فینس، اور دوسری شان وشوکت کی سواریاں ہر وقت دروازے پر موجود رہتیں۔ جب مولانا عبدالحق پیدا ہوئے تو دہلی کے خواص وعوام اور برادران وطن نے بھی بطور اظہارِ خوشی نذرانے اور تحفے لاکھوں روپیہ کے پیش کیے۔(حسرۃ العلما بوفاۃ شمس العلما مؤلفہ مولانا حکیم برکات احمد ٹونکی)

تحدیث بالنعمۃ کے طور پر خود علامہ نے قصیدہ ہمزیہ میں اپنی ترفہ وفراغت کا ذکر فرمایا ہے:

كانت بفضل الحق فضل مثالة　　منها على الامثال لی استعلاء

ووجاهة بين الوجوه وجاهة　　تعنو لها الاعيان و الرؤساء

و براعة و رفاعة و رفاهة　　و نزاهة و نباهة و علاء

جرمِ بغاوت ثابت ہوجانے پر خیرآباد کا سنگین وعالیشان دیوان خانہ اور محل سرا ضبط کر کے بہ صلۂ خیر خواہی سردار محمد ہاشم شیعی سیتاپوری (مورث اعلیٰ آغا فتح شاہ مشہور پلیڈر سیتاپور) کو دے دیے گئے۔انھوں نے رئیس کمال پور ضلع سیتاپور راجہ جواہر سنگھ کے ہاتھ پانچ سات ہزار میں

کوڑیوں کے مول فروخت کر ڈالے۔ عرصۂ دراز تک راجہ جواہر سنگھ اور ان کے بعد ان کے بیٹے راجہ سورج بخش سنگھ نے اپنی جگہ پر قائم رکھے۔

مولوی حکیم ظفر الحق بن مولانا اسد الحق بن مولانا عبد الحق خیرآبادی فرماتے ہیں کہ خود راجہ مذکور نے مجھ سے کہا کہ صرف علامہ کی یادگار میں میں نے اسے محفوظ رکھا ہے۔ جب بارش کی کثرت اور غیر آباد حالت میں پڑے رہنے سے آثار شکست و ریخت نمودار ہونے لگے تو ایک انجینئر کو درستی کے لئے بھیجا۔ تخمینۂ درستی، تیس پینتیس ہزار روپیہ بتایا تو راجہ نے مجبوراً پتھر کھدوا کر کمال پور منگوا لیے۔ اور کچھ سامان حکیم سید انوار حسین خیرآبادی مشہور طبیب و معالج خاص تعلقداران اودھ کو دے دیا۔ دروازہ بطور یادگار باقی رہنے دیا۔ جو آج بھی صاحب مکان کی عظمت وجلالت کا مرثیہ زبان حال سے پڑھ رہا ہے اور دیکھنے والوں کے لئے عبرت وموعظت کا سامان مہیا کر رہا ہے۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے

یہ مکان موسومہ ''نیا محل'' (جو ۱۹۶۶ء میں منہدم ہو چکا ہے) منشی نیاز احمد فاروقی بانیِ مدرسہ نیازیہ و رئیس خیرآباد کے مکان کی نقل تھا۔ فرق اتنا تھا کہ اس میں دو تہ خانے تھے۔ اور منشی صاحب کے مکان میں ایک ہے۔ آگرہ وغیرہ سے پتھر منگوائے گئے تھے۔ تقریباً بیس سال ہوئے جب یہ مکان کھدوایا گیا تھا۔ مولانا حکیم احمد علی صاحب خیرآبادی فرماتے ہیں کہ علامہ کا کتب خانہ بھی ضبط کر لیا گیا تھا۔

جب خلف الرشید مولانا عبد الحق خیرآبادی کو دلداری کے پیش نظر ۱۶ر فروری ۱۸۸۷ء میں لارڈ ڈفرن گورنر جنرل ہند کے دستخط سے سند خطاب ''شمس العلما'' بلا کسی طلب و کوشش کے ملی تو علامہ کے ضبط شدہ دیہات میں سے کچھ دیہات بھی واپس دیئے جانے کا حکم دیا گیا۔ مولانا فرمایا کرتے تھے! باپ کو کالا پانی کیا اور بیٹے کی خطاب سے اشک شوئی کی۔

مولانا عبد الحق خیرآبادی رام پور میں تھے۔ خیرآباد کے ایک باشندے یار علی نے علامہ فضل حق خیرآبادی کا بیٹا بن کر وہ دیہات قبضے میں لے لیے۔ ''اندھیر نگری چوپٹ راج'' کی مثال اس سے بڑھ کر اور کیا مل سکے گی؟ مولانا عبد الحق نے عذر داری وغیرہ کسرِ شان سمجھ کر خاموشی اختیار فرمائی۔ بعد میں یار علی نے مصلحتاً یہ دیہات بیچ ڈالے۔

ان میں سے ایک موضع زین پور ہے جو حضرت مولانا شاہ سید محمد اسلم خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ سجادہ نشیں آستانۂ حافظیہ المتوفی ۱۳۲۰ھ نے ایک ہزار میں خرید کر اپنے پیرومرشد حافظ سید محمد علی شاہ خلیفۂ حضرت شاہ محمد سلیمان تونسوی کے مصارفِ درگاہ کے لئے وقف کردیا۔ جس کا انتظام سجادہ نشینان درگاہ کرتے رہے ہیں۔ حافظ سید امتیاز حسین سجادہ نشین کے انتقال کے بعد اب میاں سید ماجد حسین حال سجادہ نشین اس کا انتظام کرتے ہیں۔ دوسرا موضع نندو پوروہ لالہ نندولال نے ایک ہزار میں خریدا۔ اس طرح علامہ کے اخلاف پریشانِ روزگار رہے۔

علامہ فضل حق خیرآبادی کی اس خاندانی شاہانہ زندگی کے ساتھ جب انقلاب ۱۸۵۷ء کے روح فرسا اور صبر آزما حالات کے پیش آنے کا تصور ہوتا ہے تو موصوف کی شخصیت، استقلال، ثباتِ قدم اور مجاہدانہ عزم کا اندازہ ہوتا ہے۔ خصوصاً جب اس زمانہ کے عیش وراحت میں پلنے والے ''مجاہدوں'' پر نظر پڑتی ہے تو علامہ کا مرتبہ کتنا بلند ہوجاتا ہے۔

ہندوستان کی صد سالہ مکمل غلامی میں کتنی مرتبہ مسلمانوں پر مصائب وشدائد کے پہاڑ توڑے گئے۔ اسی حکومت برطانیہ کے ہاتھوں سرزمین حجاز وشام ومصر کے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے۔ اسی کے ہاتھوں ٹرکی کا مردِ بیمار گرفتارِ آزار ہوا۔

اسی نے قبلۂ اول بیت المقدس (فلسطین) جیسے پاکستان کو ناپاکستان بنانے کی تجویز کی۔ اسی کی بدولت ترکی وعرب کے مسلمانوں پر ہندوستانی فوجوں نے گولیاں چلائیں۔ موپلہ قوم کی بربادی کی ذمہ دار بھی یہی بدنام حکومت تھی۔ انڈونیشیا (جاوا) اور وزیرستان پر بمباری وفوج کشی کرنے والی یہی سلطنت تھی۔ دولتِ عثمانیہ کی چادر کو ٹکڑے ٹکڑے اسی دولتِ برطانیہ نے کیا تھا۔

ان تمام دردناک مصائب کے باوجود ہندوستان کا یہ مسلمان عیش پرست وجاہ پسند طبقۂ امرا خواب راحت میں سوتا رہا۔ سوتا ہی رہتا تو بھی زیادہ شکوہ نہ تھا۔ جاگا اور مسلمانان ہندو مقاماتِ مقدسہ کے سینوں کو چھلنی کرانے کے لئے رنگروٹوں کی بھرتی کرائی۔ حیثیت سے زیادہ چندے دے دیئے۔ وفاداری کا پورا پورا مظاہرہ کیا۔ بڑے بڑے عہدے اور خطابات حاصل کیے۔ انعامی جاگیریں پائیں۔ مختصر یہ کہ وہ سب کچھ کیا جو نہ کرنا چاہیے تھا۔ اور وہ کچھ نہ کیا جو کرنا چاہیے تھا۔

آج جب کہ حکومت برطانیہ کا رختِ سفر بندھ چکا۔ پر پرواز تُل چکے۔ بین الاقوامی حالات

اور ملکی تحریکات نے اسے سب کچھ چھوڑنے پر مجبور کر دیا تو اس درندہ صفت، انسان نما گروہ نے بھاگتے بھوت کی لنگوٹی یعنی خطابات کی واپسی کو جہاد سے تعبیر کرنا شروع کیا۔ اور بغلیں بجا بجا کر اپنی بہادری کا ڈنکا پیٹنے لگے۔ حالاں کہ دنیا جانتی ہے کہ یہ انسانی لباس میں درندے اور بھیڑ کی کھال میں بھیڑیے ہیں۔ ملک وقوم کے غدّاروں اور مذہب وملت کے منافقانِ سرمدی ہیں۔

من جرّب المجرب حلّت به الندامة۔

آزمائے ہوئے کو آزمانے سے آخر میں شرمندگی اٹھانا پڑتی ہے۔

علامہ فضل حق کی سیاسی بصیرت اور فطری فہم وفراست کا اندازہ الثورۃ الھندیہ کی تمہیدی عبارت کے بعد آنے والی عبارت سے لگایئے جس کی ابتدا من قصتھا کے جملہ سے شروع ہوتی ہے۔ علامہ نے اس میں بتایا ہے کہ ہندوستان پر تسلط کے بعد انگریز بقاء سلطنت کے لئے دو اسکیموں پر عمل کرنے کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔

اول: یہ کہ پچھلے زمانہ کے علوم ومعارف اور مدارس ومکاتب مٹانے کے بعد اسکولوں کی یکساں تعلیم کا رواج جس سے ہر مذہب وملت کے افراد ایک ہی رنگ میں رنگ جائیں۔

دوم: یہ کہ غلّہ پر کنٹرول کر کے خدا کی مخلوق کو سر جھکانے پر مجبور کر دیا جائے۔

علامہ لکھتے ہیں:

”انگریزوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر فرقوں کا اختلاف، تسلط وقبضہ کی راہ میں سنگِ گراں ثابت ہوگا۔ اور سلطنت میں انقلاب پیدا کر دے گا۔ اس لئے پوری تندہی اور جانفشانی کے ساتھ مذہب وملت کے مٹانے کے لئے طرح طرح کے مکر وحیلہ سے کام لینا شروع کیا۔ انھوں نے بچوں اور ناسمجھوں کی تعلیم اور اپنی زبان و مذہب کی تلقین کے لئے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کیے۔ پچھلے زمانہ کے علوم ومعارف اور مدارس ومکاتب کے مٹانے کی پوری کوشش کی۔

دوسری ترکیب یہ سوچی کہ مختلف طبقات پر قابو اس طرح حاصل کیا جائے کہ زمین ہند کے غلہ کی پیداوار کاشتکاروں سے لے کر نقد دام ادا کیے

جائیں۔ اوران غریبوں کوخرید وفروخت کا کوئی اختیار نہ چھوڑا جائے۔ اس طرح نرخ گھٹانے، بڑھانے اور منڈیوں تک اجناس پہنچانے اور نہ پہنچانے کے خود ہی ذمہ دار بن بیٹھیں۔ اس کا مقصداس کے سوا کچھ نہیں کہ خدا کی مخلوق، مجبور ومعذور ہوکر ان کے قدموں میں آپڑے۔ اور خوراک وغیرہ نہ ملنے پران کے ہر حکم کی تعمیل اور ہر مقصد کی تکمیل کرے۔

پہلی اسکیم کے متعلق لارڈ میکالے کے یہ جملے کافی سند ہیں:

”ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو۔ اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہیے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رائے، زبان اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔“

دوسری اسکیم پر جب عمل ہوا ہو یا نہ ہوا ہو لیکن اس چار سالہ زمانۂ جنگ (عظیم) کے کنٹرول عمل درآمد نے باشندگانِ ہند کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ غلّہ کا ملنا دشوار، کنٹرول کی دکانوں سے لینے میں عزت وآبرو اور وقت عزیز کی بربادی، شہر میں ذراسی گڑبڑ پر دکانوں اور گوداموں کی قفل بندی، ان سب مصیبتوں کا مستقل ہر کہ ومہ کو سامنا رہا ہے۔

۱۱ر جولائی ۱۹۴۶ء سے پوسٹ مینوں اور کم تنخواہ والے ملازمین پوسٹ آفس کی جائز احتجاجی ہڑتال پر راشن کی سہولتیں چھین لینے کی مرکزی حکومت کی طرف سے دھمکی نے علامہ کے بیان کو بالکل سچ کر دکھایا۔

کیا سچا ارشاد ہے سرکار دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا:

اتقوا فراسة المؤمن فانه ينظر بنورِ الله۔

مومن کی فراست سے ڈرتے رہو۔ یہ اللہ کے نور سے سب کچھ دیکھ اور سمجھ لیتا ہے۔

کہاں ہیں اس قول کے قائل کہ ”مولوی کو سیاست نہیں آتی“؟ آئیں۔

اور رسالہ الثورۃ الہندیہ پڑھیں۔

مولوی کی سیات غلام دماغ نہیں سمجھ سکتا۔ انگریز سمجھتا ہے سوچو اور غور کرو۔

۹۰ رسال قبل سارے دفاتر پر اسی طبقہ کا قبضہ تھا۔ علما و مشاہیر وقت سرکاری و شاہی محکموں پر قابض تھے۔

مولانا فضل امام خیر آبادی صدر الصدور دہلی، مفتی صدر الدین خاں آزردہ صدر الصدور دہلی، مفتی عنایت احمد کاکوروی مصنف وصدر امین کول و بریلی، مولوی فضل رسول بدایونی سررشتہ دار کلکٹری صدر دفتر سہوان، مفتی انعام اللہ گوپاموی قاضی دہلی و سرکاری وکیل الہ آباد۔ مولانا مفتی لطف اللہ علی گڑھی سررشتہ دار صدر امین بریلی، علامہ فضل حق خیر آبادی سررشتہ دار ریزیڈنسی دہلی وصدر الصدور لکھنؤ و مہتمم حضور تحصیل اودھ، مولوی غلام قادر گوپاموی ناظر سررشتہ دار عدالت دیوانی و تحصیلدار گوڑگاواں، مولوی قاضی فیض اللہ کشمیری سررشتہ دار صدر الصدور دہلی وغیرہم۔ یہ سب اپنے وقت کے بے نظیر و عدیم المثال اکابر علما تھے۔ حکومت کی باگ ڈور انھیں کے ہاتھ میں تھی۔ مسلمانوں کی سلطنت کی بربادی ان کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ موقع کا انتظار تھا۔ ۱۸۵۷ء کا وقت آیا تو سب میں پیش پیش یہی حضرات تھے۔

والیانِ ریاست وارا کینِ دولت میں ناقوس حریت پھونکنے والے یہی تھے۔ عوام کو ابھارنا اور فتویٰ جہاد جاری کرنا انھیں کا کام تھا۔ اور انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد سب سے زیادہ مصائب اٹھانے والے اور آتشِ حریت میں جلنے والے یہی شمع شبستان آزادی کے پروانے تھے۔

انگریز نے ان کو جانا اور پہچانا۔ ایک ایک کر کے تمام عہدوں سے اس طبقہ کہ سبکدوش اور اس گروہ کے خلاف پورا محاذ قائم کیا۔ اپنی ایک مخصوص جماعت چھوڑی جس کا سب سے بڑا مقصد علما کی تذلیل و توہین، ان کو سیاست سے نابلد بتا کر اور دقیانوسیت کا الزام لگا کر قوم کی زمامِ قیادت پر قبضہ کرنا تھا۔

اے کاش! مسلمان قوم سوچتی کہ وہ انگریز کی صد سالہ اسکیم کو اس پردے میں عملی جامہ پہنا رہی ہے۔ وہ اپنے مجاہدین و سرفروش علما کی توہین و تذلیل ان سرکاری ایجنٹوں کے اشاروں پر نادانستگی سے نہیں کر رہی ہے بلکہ اپنے پاؤں میں اپنے ہی ہاتھوں سے کلھاڑی مار رہی ہے۔

ہمیں نیک شگون بیت المقدس پر قبضۂ نصاریٰ سے ملتا ہے۔ ۱۰۹۹ء سے ۱۱۸۷ء تک ۸۸

سال تسلط رہا۔ جس میں ظلم وتعدی کی انتہا ہو چکی تھی۔ آخر سلطان صلاح الدین ایوبی نے پرچم اسلام لہرایا۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۵ء تک بھی ۸۸ سال ہی ہوتے ہیں۔ مظالم ومصائب کا یہاں بھی خاتمہ ہو چکا ہے۔ پہلی شملہ کانفرنس ۱۹۴۵ء میں ہی حکومت برطانیہ ہتھیار ڈال چکی تھی۔ دوسری شملہ کانفرنس ۱۹۴۶ء میں اسے شکست کا منھ دیکھنا پڑا۔

یہ بھی حسنِ اتفاق تھا کہ ۲۷ر رجب ۵۸۳ھ کو مسجد اقصائے بیت المقدس میں سلطان نے نماز شکر ادا کی۔ جب کہ اسی تاریخ میں سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے شب معراج میں اسی مقام پر امامتِ انبیا فرمائی تھی۔ اسی طرح یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ یروشلم کی طرح، ہندوستان بھی اسی قوم کے ہاتھوں سے اسی مدت میں آزاد ہو رہا ہے۔ (ملخص۔ ص ۲۱۲ تا ۲۲۷۔ باغی ہندوستان مؤلفہ مولانا عبد الشاہد شیروانی علی گڑھی۔ طبع چہارم المجمع الاسلامی مبارک پور۔ ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء)

☆☆☆☆☆☆☆

فتوائے جہاد اور قائدانہ کردار

راجہ غلام محمد (لاہور)

علامہ فضل حق خیر آبادی کے فتوائے جہاد کی صدائے باز گشت سناتا ہوں:

''علما نے جس جس طرح بغاوت کو منظم کیا، اس کو مفصل بیان کرنے کے لئے تو ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے مگر ان کا کچھ تذکرہ ان صفحات پر کیا جا رہا ہے۔ اس حقیقت سے بڑے بڑے مؤرخ بھی انکار کی جرأت نہیں کر سکے ہیں کہ یہ علما عوام میں بے حد مقبول تھے۔ ان کی تحریر و تقریر کا بڑا اثر ہوتا تھا۔ چنانچہ دہلی میں جنرل بخت خاں کی تحریک پر مولانا فضل حق خیر آبادی اور دوسرے علمائے نے جو جہاد کا فتویٰ دیا، اس کے بارے میں مولوی ذکاء اللہ دہلوی نے بھی اپنی تاریخ میں اقرار کیا ہے کہ اس سے مذہبی جوش و خروش بہت بڑھ گیا تھا۔''

(ص ۴۵۵۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء۔ از خورشید مصطفیٰ رضوی۔ مکتبہ برہان دہلی ۱۹۵۹ء)

''مولانا (فضل حق خیر آبادی) کے دہلی پہنچنے سے پیشتر بھی لوگوں نے جہاد کا پرچم بلند کر رکھا تھا۔ مولانا پہنچے تو مسلمانوں کو جنگِ آزادی پر آمادہ کرنے کی غرض سے باقاعدہ ایک فتویٰ مرتب ہوا جس پر علمائے دہلی کے دستخط لیے گئے۔ میرا خیال ہے کہ یہ فتویٰ مولانا فضل حق ہی کے مشورے سے تیار ہوا تھا اور انھوں نے علما کے نام تجویز کیے، جن پر دستخط لیے گئے۔''

(۱۸۵۷ء کے مجاہد۔ از غلام رسول مہر، ص ۲۰۶۔ کتاب منزل لاہور۔ ۱۹۶۰ء)

پاکستان کے نامور شاعر ناصر کاظمی اور مشہور کالم نویس انتظار حسین کی ادارت میں شائع ہونے والے مجلّہ ''خیال'' کے سن ستاون نمبر میں شکور احسن صاحب مفتی صدرالدین آزردہ پر مضمون لکھتے ہوئے علامہ کے فتوائے جہاد کا ذکر کرتے ہیں:

''جب برطانوی استعمار کے خلاف ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہوا تو بعض

شاعروں، ادیبوں اور عالموں نے اس میں سرگرمی سے حصہ لیا اور انگریزی حکومت کا اقتدار بحال ہو جانے کے بعد ان پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ گئے۔ مولانا فضل حق کو جہاد کا فتویٰ صادر کرنے کے جرم میں انڈمان بھیجا گیا۔ صہبائیؔ کو پھانسی کے تختہ پر لٹکایا گیا۔ شیفتہؔ کو قید و بند کی مصیبتیں برداشت کرنی پڑیں۔''

(مجلّہ ''خیال'' لاہور، سن ستاون نمبر، ص ۲۶۸)

مفتی صدرالدین آزردہؔ ہی کے بیان میں مفتی انتظام اللہ شہابیؔ فتویٔ جہاد کی تیاری کی ساری ذمہ داری مولانا فضل حق پر ڈالتے ہیں:

''ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں رونما ہوا۔ مولانا فضل حق الور سے دہلی آئے۔ جنرل بخت خان نے نقشۂ اقتدار جما رکھا تھا۔ استفتا مولانا نے لکھا۔ مفتی صاحب و دیگر علما نے فتویٰ دیا...... مولانا فضل حق کو اقرارِ جرم پر انڈمان جانا پڑا۔''

(غدر کے چند علما۔ از انتظام اللہ شہابیؔ۔ ص ۴۸۔ دینی بکڈپو۔ دہلی)

رئیس احمد جعفری تمام عمر آزادی کی تحریک کی جزئیات کھنگالتے رہے۔ وہ اپنی ضخیم کتاب ''بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد'' میں لکھتے ہیں:

''مولانا فضل حق خیرآبادی علمی قابلیت میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ ان کو فتویٔ جہاد کی پاداش اور جرم بغاوت میں انڈمان بھیج دیا گیا۔''

(''بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد'' از رئیس احمد جعفری، ص ۳۱۵۔ کتاب منزل لاہور۔ ۱۹۵۶ء)

محمد اسمٰعیل پانی پتی اپنے مضمون ''۱۸۵۷ء میں علمائے کرام کا حصہ'' میں مولانا فضل حق کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامۂ عظیم دہلی میں رونما ہوا تو (علامہ فضل حق خیرآبادی) فوراً دہلی پہنچے اور جہاد کا فتویٰ دیا۔ جنرل بخت خاں کمانڈر ان چیف افواجِ ظفر سے ملے اور اس کی بڑی اعانت اور امداد کی... لکھنؤ میں ان پر مقدمہ قائم ہوا۔ نہایت بے باکی اور صفائی کے ساتھ بغیر ذرہ بھر ہچکچاہٹ اور تذبذب کے اقرار کیا کہ ہاں! میں نے فتویٰ لکھا اور اس پر

دستخط کیے اور جو کچھ میں نے کیا اپنے خیال میں ٹھیک کیا۔" (ماہنامہ لیل و نہار لاہور۔ جنگِ آزادی نمبر ۱۸۵۷ء، ص ۲۸۔ ۱۲ مئی ۱۹۵۷ء)

پاکستان کے مشہور جریدۂ تحقیق "الزبیر" کے تحریک آزادی نمبر کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"مولانا فضل حق ۔۔نے ایک دن بعدِ نماز جمعہ جامع مسجد میں انگریزوں کے خلاف فتویٰ پڑھ کر سنایا تو بہتوں کے لئے باعثِ تشویش بنا۔ اس فتویٰ پر مفتی صدرالدین آزردہ اور دوسرے پانچ علما کے دستخط تھے۔ اس کا شائع ہونا تھا کہ جدو جہد نے ایک نیا زور پکڑا اور جگہ جگہ انگریزوں کے چھکے چھوٹ گئے......

تاریخ ذکاء اللہ کے مطابق اس فتویٰ کے بعد صرف دہلی میں نوے ہزار سپاہ جمع ہوگئی...... سرکاری وکیل کے مقابلے میں انھوں نے خود بحث کی اور سب الزام ایک ایک کر کے رد کر دیئے۔ لیکن فتویٰ کے بارے میں آخر تک اڑے رہے کہ وہ فتویٰ صحیح ہے اور میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری رائے یہی ہے۔"

(سہ ماہی "الزبیر" بہاول پور، تحریک آزادی نمبر شمارہ ۱۹۷۰ء، ص ۹۲)

مفتی انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی "علمائے حق اور ان کی مظلومیت کی داستانیں" کے صفحہ ۵۶ پر لکھتے ہیں:

"دلاور جنگ مولوی احمد اللہ شاہ مدراسی آگرہ سے لکھنؤ آئے۔ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کے خلاف علما میں سرگرمِ عمل پیدا کر رہے تھے۔ مولانا (فضل حق) بھی ان کے ہمنوا ہو گئے اور سرکاری ملازمت ترک کر کے الور چلے گئے۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء رونما ہوا۔ دلّی آئے۔ بہادر شاہ سے ملے۔ یہاں جنرل بخت خان کے ٹھاٹ جمے ہوئے تھے۔ نصاریٰ کے خلاف جہاد کا فتویٰ مولانا نے دیا اور اس پر مفتی صدرالدین آزردہ، مولوی فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبر آبادی وغیرہ کے دستخط کرائے گیے۔"

''جج کے سامنے آپ کی موجودگی میں سرکاری گواہ پیش ہوا۔ اس نے آپ کو دیکھا تو کہنے لگا'' یہ وہ فضل حق نہیں ہیں جنھوں نے جہاد کا فتویٰ دیا تھا۔ وہ دوسرے ہیں۔''

آپ فوراً بول اٹھے'' پہلی اطلاع اس کی صحیح ہے اب غلط کہہ رہا ہے۔ مجھ پر جو جرم عائد کیا گیا ہے وہ درست ہے۔ میں نے ہی فتویٰ لکھا اور آج بھی میری رائے وہی ہے۔''

جج نے حبسِ دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا تجویز کی جو بہ خندہ پیشانی قبول فرما کر انڈمان گئے۔''

یہی مفتی صاحب اپنی دوسری کتاب میں بھی علامہ کے فتویٰ کے حق میں فتویٰ دیتے ہیں:

''مولانا نے اپنے اوپر کے بقیہ الزام رد کرنے کے بعد پلٹا کھایا اور کہا کہ جس مخبر نے فتویٰ کی خبر کی اس کے بیان کی اب میں توثیق کرتا ہوں۔ میرا ہی لکھا ہوا ہے۔ اور میرے ہی مشورے سے علما نے دستخط کیے۔ پہلے اس گواہ نے سچ رپورٹ لکھوائی تھی مگر اب عدالت کے سامنے میری صورت سے مرعوب ہو کر جھوٹ بولا ہے۔ مجھے خدا کے حضور جانا ہے۔ غلط بات مذہب کے معاملے میں نہیں بول سکتا۔'' (''ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما'' از مفتی انتظام اللہ شہابی۔ ص ۵۳۔ دینی بکڈپو۔ دہلی)

مکتبہ بُرہان دہلی کی شائع کردہ کتاب ''جنگ آزادی اٹھارہ سو ستاون'' از خورشید مصطفیٰ رضوی میں ہے:

''کہا جاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء قریب آنے پر آپ (فضل حق) نے اکثر والیانِ ریاست کو بغاوت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ اگست ۱۸۵۷ء میں دہلی آگئے اور یہاں جنرل بخت خان کی تحریک پر جہاد کا فتویٰ مرتب کر کے پیش کیا۔ جس سے مسلمانوں میں بے حد جوش و خروش پیدا ہو گیا۔''

لکھنؤ میں مقدمہ چلا جس میں حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ مولانا بَری ہو جائیں مگر آپ نے برسرِ عدالت کہہ دیا کہ ''میں نے جہاد کا فتویٰ دیا تھا

اور آج بھی میری وہی رائے ہے۔'' (جنگ آزادی ۱۸۵۷ء،
ص ۵۸،۴۵۷)

علامہ فضلِ حق کی کتاب ''الثورۃ الہندیہ'' کے اردو ترجمے کے مقدمہ میں لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اورنٹیلسٹ محمد عبدالشاہد خاں شیروانی لکھتے ہیں:

''اس رسالہ کو دیکھنے سے اس وقت کے خوفناک حالات کا نقشہ سامنے آجاتا ہے اور نصاریٰ کے خوفناک عزائم کا پتہ چلتا ہے کہ کس طرح ہندوستان کی رعایا کے گلے میں دائمی غلامی اور نصرانیت کا پٹہ ڈالنے کی کوشش کی جارہی تھی اور علمائے مجاہدین کا ایسے مواقع پر اعلانِ جہاد کس قدر بروقت اور ضروری تھا۔

علامہ خیرآبادی کا رجب ۱۲۷۵ھ میں باطل قوتوں کے سامنے یہ اعلانِ حق ہمیشہ آبِ زر سے لکھا جاتا رہے گا کہ۔''وہ فتویٰ صحیح ہے'' میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے۔'' (مقدمہ ''باغی ہندوستان'' از محمد عبدالشاہد خاں شیروانی، مطبوعہ مکتبہ قادریہ، اندرون لوہاری دروازہ لاہور۔طبع ثانی ۱۳۹۴ھ/۱۹۷۴ء)

پروفیسر محمد ایوب قادری (کراچی) لکھتے ہیں:

''دہلی میں بہادر شاہ ظفر نے خودمختاری کا اعلان کردیا۔مولانا فضلِ حق خیرآبادی نیز دوسرے علما دہلی میں موجود تھے...... جنرل بخت خان کے مشورے سے علامہ فضل حق خیرآبادی نے بعد نماز جمعہ جامع مسجد دہلی میں جہاد کی اہمیت وضرورت پر تقریر کی اور جہاد کا استفتا مرتب کر کے پیش کیا۔ جہاد کے فتویٰ کی تیاری میں جنرل بخت خان کی کوشش خاص تھی۔'' (جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا ایک مجاہد! مولانا فیض احمد بدایونی۔از محمد ایوب قادری، ص ۲۲،۲۱۔پاک اکیڈمی۔کراچی ۱۹۵۷ء)

پاکستان کے مشہور محقق ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اپنے مضمون ''مولانا فضل حق خیرآبادی'' میں کہتے ہیں:

''مسلمانوں کو عزت و آبرو کی زندگی بسر کرنے کے لئے آخری مرتبہ جان کی بازی لگا دینے پر آمادہ کرنے کے لئے ایک با قاعدہ فتویٰ جہاد کا جاری کیا گیا، جس پر دستخط کرنے والوں میں مفتی صدرالدین آزردہ اور مولوی فضل حق بھی شریک تھے۔

مولانا فضل حق نے فتویٰ کے بعد جگہ جگہ دورے کیے اور بالآخر دہلی پہنچ گئے۔ اس زمانے میں ان کی سیاسی سرگرمیوں کا اندازہ جیون لال کے روزنامچے سے ہوتا ہے جس میں اس نے مختلف تاریخوں میں مولانا کا قلعے کی مجلس مشاورت میں شریک ہونا بیان کیا ہے۔ مولانا فضل حق کے مشورے صرف قلعۂ معلیٰ کی پوشیدہ مجلسوں تک محدود نہ تھے۔ وہ جنرل بخت خان سے ملے، مشورے ہوئے اور آخر میں بعد نماز جمعہ دلّی کی لال مسجد (جامع مسجد دہلی) میں علما کے سامنے تقریر کی اور فتویٰ پیش کیا۔''

(مجلّہ ''خیال'' لاہور، سن ستاون نمبر ص ۲۶۴۔۲۶۳)

پاکستان میں دیوبندی مکتبِ فکر کے آرگن ہفت روزہ ''خدام الدین'' لاہور کے ایک مضمون کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''برا ہو تاریخ کا۔ اس نے اپنے حافظہ سے ایسی ایسی جانباز، حق گو، بہادر اور جامعِ کمالات شخصیتوں کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا، جنھوں نے اپنے دور میں وقت کے تیز و تند طوفانوں سے بے خوف و خطر ٹکّر لی اور پیٹھ نہیں دکھائی۔ مولانا فضل حق رحمۃ اللہ علیہ تاریخ کے ان جواں مرد اور نڈر مجاہدین میں سے تھے جن کی جرأت و ہمت اور حق گوئی و بے باکی نے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا، مگر تاریخ کے صفحات میں ان کو شایانِ شان کیا، کوئی معمولی جگہ بھی نہیں مل سکی......

مولانا فضلِ حق خیرآبادی نے افضل الجهاد كلمة حق عند سلطانٍ جائر کا فریضہ ادا کیا اور اپنی عمرِ عزیز انڈمان میں حبس دوام کی نذر کردی......

علامہ فضل حق خیرآبادی وغیرہ نے انگریزوں کے خلاف فتویٰ دے کر

مسلمانوں کو عدم تعاون پر آمادہ کیا......

مولانا فضل حق بھی ''باغی'' قرار دیئے گئے۔ سلطنتِ مغلیہ کی وفاداری، فتویٰ جہاد کی پاداش یا جرمِ بغاوت میں مولانا ماخوذ کر کے سیتا پور سے لکھنؤ لائے گئے۔'' (مضمون۔ ''مولانا فضل حق خیر آبادی'' از مستقیم احسن حامدی فاضل

دار العلوم دیوبند ہفت روزہ خدام الدین لاہور۔ ۲۳ رنومبر ۱۹۶۲ء۔ ص ۱۰،۹)

علامہ فضل حق خیر آبادی کی استقامت کا حال مولانا حسین احمد مدنی کی زبانی سنیے:

علامہ فضل حق اپنے فتویٰ جہاد پر مفتخر ہیں اور اس الزام سے براءت کے بجائے اس کی پاداش میں ہر سزا بھگتنے کے لئے ہمہ تن تیار:

''مولانا نے اپنے اوپر جس قدر الزام لیے تھے، ایک ایک کر کے سب رد کر دیئے۔ جس مخبر نے فتویٰ کی خبر کی تھی۔ اس کے بیان کی تصدیق و توثیق کی۔ فرمایا:

''پہلے اس گواہ نے سچ کہا تھا اور رپورٹ بالکل صحیح لکھوائی تھی۔ اب عدالت میں میری صورت دیکھ کر مرعوب ہو گیا اور جھوٹ بولا۔ وہ فتویٰ صحیح ہے۔ میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے۔''......

جج بار بار علامہ کو روکتا تھا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ مخبر نے عدالت کا رُخ اور علامہ کی بارعب و پُر وقار شکل دیکھ کر شناخت کرنے سے گریز کرتے ہوئے کہہ ہی دیا تھا کہ یہ مولانا فضل حق نہیں وہ دوسرے تھے۔ گواہ حسنِ صورت اور پاکیزگیِ سیرت سے بے انتہا متاثر ہو چکا تھا مگر علامہ کی شانِ استقلال کے قربان جایئے۔ خدا کا شیر گرج کر کہتا ہے: ''وہ فتویٰ صحیح ہے میرا لکھا ہوا ہے، اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے:''

نالہ از بہرِ رہائی نہ کند مرغِ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود

شیر میسور سلطان ٹیپو کے رزم گاہِ شہادت کا یہ فقرہ کبھی نہیں بھلایا جا سکتا۔ ''شیر کی ایک روزہ زندگی گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے بہتر ہے۔''

علامہ کے اقرار و توثیق کے بعد گنجائش ہی کیا رہ گئی تھی؟ بے حد رنج کے ساتھ عدالت نے

حبسِ دوام بعبور دریائے شور کا حکم سنایا۔ آپ نے کمال مسرت اور خندہ پیشانی سے سنا۔ (نقشِ حیات۔ جلد دوم۔ از حسین احمد مدنی، ص ۴۶۲)

مولانا حسین احمد مدنی صاحب اپنی دوسری کتاب ''تحریک ریشمی رومال'' میں پھر اس شیرِحق کی شانِ استقلال پر قربان ہو رہے ہیں۔

''مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی کو جو کہ تحریک کے بہت بڑے رکن تھے اور بریلی، علی گڑھ اور اس کے ملحقہ اضلاع کے دورانِ تحریک میں گورنر تھے، آخر ان کو گھر سے گرفتار کیا گیا۔ جس مخبر نے ان کو گرفتار کرایا تھا اس نے انکار کر دیا کہ مجھے معلوم نہیں، فتویٰ جہاد پر جس نے دستخط کیے ہیں وہ یہ فضل حق ہیں یا کوئی اور ہیں؟

......مولانا نے فرمایا: ''مخبر نے پہلے جو رپورٹ لکھوائی تھی وہ بالکل صحیح تھی کہ فتویٰ میرا ہے۔ اب میری شکل وصورت سے مرعوب ہو کر یہ جھوٹ بول رہا ہے۔''

قربان جائیے علامہ کی شان استقلال پر۔ خدا کا شیر گرج کر کہہ رہا ہے کہ میرا اب بھی وہی فیصلہ ہے کہ انگریز غاصب ہے اور اس کے خلاف جہاد کرنا فرض ہے۔

خدا کے بندے ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔ وہ جان کی پروا کیے بغیر سر بکف ہو کر میدان میں نکلتے ہیں اور لومڑی کی طرح ہیر پھیر کر کے جان نہیں بچاتے بلکہ شیروں کی طرح جان دینے کو فخر سمجھتے ہیں۔''

(تحریک ریشمی رومال ۔ از حسین احمد مدنی۔ ص ۶۵،۶۴ ۔ مطبوعہ کلاسیک، لاہور۔ ۱۹۶۰ء)

''عدالت دو ججوں پر مشتمل تھی۔ جارج کیمبل جوڈیشیل کمشنر، اور میجر بارن قائم مقام کمشنر خیر آباد ڈویژن۔ اس مشترکہ عدالت نے ۴؍مارچ ۱۸۵۹ء کو اپنے فیصلے میں لکھا۔

بہر حال! عدالت کی نظر میں ثابت ہے کہ اس موقع پر ملزم نے بلاضرورت

مستعدی دکھاتے ہوئے صراحت سے ایسا فتویٰ دیا جس کا مقصد قتل کی ترغیب دینا تھا۔ اس نے قرآن کی آیات پڑھیں اور ان کے من مانے معنی کیے اور اصرار کیا کہ انگریزوں کے ملازم کافر و مرتد ہیں اس لئے شریعت کے نزدیک ان کی سزا قتل ہے۔ بلکہ اس نے باغی سردار سے یہاں تک کہا کہ تم انہیں قتل نہیں کرتے تو تم خدا کی نظر میں مجرم ہو۔'' (ماہنامہ ''تحریک'' دہلی۔ جون ۱۹۶۰ء۔ بحوالہ غالب نام آورم از نادم سیتاپوری۔ ص ۱۱۸، ۱۱۷۔ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔ ۱۹۷۰ء)

رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں:

''مذکورہ سطور میں ہم نے غدر کے جن ہیروؤں کا ذکر کیا ہے ان میں سے صرف بخت خان اور مولانا فضل حق خیرآبادی دو ایسی شخصیتیں ہیں جنھوں نے دہلی کے محاربات غدر میں مرکز نشیں ہو کر حصہ لیا ہے......

بخت خان اور مولانا فضل حق کے احوال و سوانح، واقعات و حوادث کارناموں اور سرگرمیوں کی تفاصیل معلوم کرنا آسان نہ تھا...... غدر کے بعد غدر کا ذکر بھی کتنا روح فرسا تھا اور ان شخصیتوں کا تذکرہ جنھوں نے اس انقلابی تحریک میں مردانہ وار حصہ لیا تھا۔ اپنی جان سے ہاتھ دھونا تھا۔......

ان اکابر کا اوّل تو مرتب اور منضبط صورت میں کہیں ذکر نہیں ملتا اور اگر کہیں ملتا بھی ہے تو مخالفانہ اور معاندانہ انداز میں۔ ان مشکلات کے باوجود زیادہ سے زیادہ معتبر اور مستند مواد حاصل کرنے کی اپنے مقدور بھر ہم نے کوشش کی ہے۔ (بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد۔ ص ۸۳۴)

خونِ دل کو صرفِ گلشن کر، مگر یہ سوچ کر
تیرے سر الزام تحریکِ خزاں بھی آئے گا

جناب حسین احمد مدنی مولانا فضل حق رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے تلامذہ اور ساتھیوں کے جہادِ حریت میں بڑے پیمانہ پر حصہ لینے کی گواہی دیتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ علامہ نے جنگ آزادی میں ہر طرح حصہ لیا، کیوں کہ وہ اخلاص کے ساتھ یہ یقین رکھتے تھے کہ انگریزوں کی غلامی ہماری

ملّی زندگی کے لئے زہر قاتل کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے لئے انھوں نے مقدور بھر اضطراب کا اظہار کیا اور انگریزوں کو زک پہنچانے کے لئے مختلف عملی اقدام کیے۔

''بہر حال! مسلمان علما میں سے مولانا احمد اللہ شاہ صاحب دلاور جنگ مدراسی اور مولانا فضلِ حق صاحب خیر آبادی اور مولوی امام بخش صہبائی، مفتی صدرالدین آزردہ صدر الصدور، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولانا فیض احمد بدایونی، مولوی عبدالقادر صاحب، مولوی وزیر خاں اکبرآبادی، سید مبارک شاہ رام پوری، مفتی عنایت احمد کاکوروی...... اور ان حضرات کے تلامیذ وغیرہ نے جہادِ حریّت ۱۸۵۷ء میں بڑے پیمانہ پر حصہ لیا تھا۔''
(''نقشِ حیات'' حصہ دوم۔ص ۴۲۰۔ از حسین احمد مدنی)

تحریک آزادی کی مشہور تاریخ نگار سیدہ انیس فاطمہ بریلوی علامہ فضل حق خیر آبادی کو طبقۂ علما کا سر گروہ قرار دیتے ہوئے لکھتی ہیں:

''خواص میں جنرل بخت خان، فیروز شاہ، نانا راؤ، نواب تجمل حسین خان، جنرل محمود خاں اور عظیم اللہ خاں تھے اور علما کے سر گروہ مولوی احمد اللہ، مولوی لیاقت علی اور مولوی فضل حق خیر آبادی قرار پائے۔'' (۱۸۵۷ء کے ہیرو۔ص ۷۰۔ اقبال بکڈپو، کراچی۔ ۱۹۵۶ء)

پروفیسر محمد ایوب قادری لکھنؤ میں علامہ کی سرگرمیوں کی تصدیق کر رہے ہیں:

''جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مولانا فضل حق نے حصہ لیا۔ دہلی میں جنگِ آزادی کے آخری مرحلے میں پہنچے۔ لکھنؤ میں بیگم حضرت محل کی کورٹ کے ممبر رہے۔ آخر میں گرفتار ہوئے۔ مقدمہ چلا اور حبسِ دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔'' (جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات) از پروفیسر محمد ایوب قادری۔ص ۴۳۸۔ پاک اکیڈمی کراچی ۱۹۷۶ء)

ایک جریدے میں مولانا امداد صابری دہلوی نے انگریزی جاسوسوں کی رپورٹوں اور روزنامچوں وغیرہ کے حوالے سے دہلی کی جنگِ آزادی میں علامہ فضل حق کے فعال کردار پر روشنی ڈالنے کے بعد منشی ذکاء اللہ دہلوی کی کتاب کا ذکر بھی کیا ہے:

''یہ تو محبِ وطن حضرات کے مخبروں، جاسوسوں اور دشمنوں کی رپورٹوں اور روزنامچوں میں اپنے انداز میں مولانا فضل حق نے ۱۸۵۷ء کی دہلی کی جنگِ آزادی میں جو حصہ لیا تھا، اس کے بارے میں رائے ہے......

منشی ذکاء اللہ صاحب نے اپنی مشہور تصنیف ''تاریخِ عروجِ سلطنتِ انگلشیہ ہند'' میں مولانا فضل حق خیرآبادی کی خدمات کا ذکر کیا ہے۔ جو انھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں انجام دی تھیں اور ان کی پاداش میں ان کو جلاوطن ہونا پڑا۔''

(جامعہ'' دہلی، نومبر ۱۹۶۲ء مضمون امداد صابری، ص ۲۶۸)

اس صفحے پر ہی لکھتے ہیں:

''یہ بات تو مسلمہ ہے کہ مولانا فضل حق خیرآبادی نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حصہ لیا۔''

جنرل بخت خان مجاہدینِ جنگِ آزادی کے سربراہ تھے۔ لکھنؤ میں بیگم حضرت محل نے حریت کا پرچم اٹھایا تھا اور علامہ فضل حق دونوں جگہوں پر ان دونوں کے معتمد تھے اور ان کی کارروائیوں میں شریک رہے۔

''جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں مولانا (فضل حق) نے مردانہ وار حصہ لیا۔ دہلی میں جنرل بخت خان کے شریک رہے۔ لکھنؤ میں حضرت محل کی کورٹ کے ممبر رہے۔ جب انگریزوں کو فتح ہوئی تو گرفتار ہوئے۔''

(علم وعمل (وقائع عبدالقادر خانی) جلد اول مترجم مولوی معین الدین افضل گڑھی ص ۲۵۶۔ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ ۱۹۶۰ء)

''جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مولانا فضل حق نے مردانہ وار حصہ لیا۔ دہلی میں جنرل بخت خان کے شریک رہے۔ لکھنؤ میں حضرت محل کی کورٹ کے ممبر رہے۔ آخر میں گرفتار ہوئے۔ مقدمہ چلا بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔'' (تذکرہ علمائے ہند از مولوی رحمٰن علی۔ ص ۳۸۳)

محمد ایوب قادری صاحب نے اپنی کتاب میں مولانا فضل حق کے بیگم حضرت محل کی کورٹ کے ممبر ہونے کا اور اپنے ایک مضمون میں جنرل بخت خان کی مشاورت میں بھی ان کے شریک

ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ پھر وہ علامہ کے قصائد اور ان کی کتاب کو جنگِ آزادی کا ''نہایت قابل قدر ماخذ'' قرار دیتے ہیں۔

''جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں مولانا فضل حق نے حصہ لیا۔ دہلی میں جنرل بخت خان کے شریک رہے۔ لکھنؤ میں بیگم حضرت محل کی کورٹ کے ممبر رہے۔ آخر میں گرفتار ہوئے۔ مقدمہ چلا اور حبسِ دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی......

انڈمان ونکوبار کے زمانۂ قیام میں علامہ خیرآبادی کی دو چیزیں یادگار ہیں— ''الثورۃ الھندیہ'' اور ''قصائد فتنۃ الھند'' یہ دونوں چیزیں تاریخی ہونے کے علاوہ ادب کا بھی شاہکار ہیں ...... یہ رسالہ اور قصیدہ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے حالات کے نہایت قابلِ قدر ماخذ ہیں۔''

(مقالہ ''جزائر انڈمان ونکوبار میں مسلمانوں کی علمی خدمات'' از محمد ایوب قادری، سہ ماہی ''اردو'' کراچی۔ جنوری ۱۹۶۸ء ص ۶۲)

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے ''۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ'' مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی کے صفحہ ۹۶، ۹۷ اور ۱۶۲، ۱۶۳ پر بتایا ہے:

''جب زمانہ میں شور و شر پھیلا تو مولوی فضل حق خیرآبادی نے دہلی کا عزم کیا اور (بادشاہ کی) بارگاہ میں باریابی کے آرزومند ہوئے اور نذر اور نثار کے لئے بہت سا روپیہ پیش کیا''۔

روزنامچے میں ان کی جلالتِ علمی کا ذکر ان الفاظ میں ہے:

''مولوی فضل حق نے مختلف علوم میں خاص مرتبہ حاصل کیا تھا۔ یقیناً فن منطق میں ان کا علمی سرمایہ اجتہاد کے درجہ تک پہنچا ہوا تھا۔''

مولانا فضل حق کی دربار شاہ میں مصروفیت کے بارے میں منشی جیون لال اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے:

''۱۶/ اگست ۱۸۵۷ء: مولوی فضل حق شریکِ دربار ہوئے۔ انھوں نے اشرفی نذر پیش کی اور صورت حال کے متعلق بادشاہ سے گفتگو کی۔

۱۸/ اگست ۱۸۵۷ء: مولوی فضل حق نے اطلاع دی کہ انگریزی

اخبارات لکھ رہے ہیں کہ شہر پر قبضہ ہو جانے کے بعد باشندوں کا قتلِ عام کیا جائے گا۔

۶ رستمبر ۱۸۵۷ء: مولوی فضل حق نے اطلاع دی کہ متھرا کی فوج آگرہ چلی گئی ہے اور انگریزوں کو شکست دینے کے بعد شہر پر حملہ کر رہی ہے۔''

(علمائے ہند کا شاندار ماضی جلد چہارم۔ ۱۸۵۷ء اور جانبازانِ حریت، از سید محمد میاں۔ ص ۴۹۴۔ الجمعیۃ بکڈپو۔ دہلی)

مشہور مؤرخ رئیس احمد جعفری علامہ کی دوسری مصروفیات کے علاوہ والیانِ ریاست اور امرائے ہند کو جنگِ آزادی میں شامل کرنے کی کوششوں کا ذکر یوں کرتے ہیں: (قارئین کرام اس سے پہلے خورشید مصطفیٰ رضوی کی کتاب کا اقتباس ملاحظہ کر چکے ہیں)۔

''وہ (فضل حق خیرآبادی) انگریزوں سے نفرت کرتے تھے اور انگریزوں کو نکالنے کے لئے ہر منظم اور باقاعدہ تحریک میں حصہ لینے پر دل و جان سے آمادہ رہتے تھے۔ چنانچہ غدر جب شروع ہوا تو مولانا بے تأمل اس میں شریک ہوئے۔

وہ بہادر شاہ کے معتمد، مقرب اور مشیر تھے۔ ان کے دربار میں شریک ہوا کرتے تھے۔ انہیں اہم معاملات و مسائل پر مشورے دیتے تھے اور اس بات کے ساعی تھے کہ آزادی کی یہ تحریک کامیاب ہو اور انگریز اس دیس سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جائیں۔

مولانا نے غدر میں دلیری اور جرأت کے ساتھ علانیہ حصہ لیا۔ انھوں نے متعدد والیانِ ریاست اور امرائے ہند کو اس تحریک میں شامل کرنے کی کوشش کی، جس جس والی ریاست سے ان کے ذاتی تعلقات و مراسم تھے۔'' (بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد۔ ص ۸۹۲۔ کتاب منزل لاہور ۱۹۵۶ء)

علامہ فضل حق بہادر شاہ ظفر سے مشورے کرتے ہیں۔ فوجی تنظیم کا جائزہ لیتے ہیں۔ آزادی کے لئے کام کرنے والوں سے مستقل رابطہ رکھتے ہیں اور پھر اس جدوجہد میں سردار کے مشیر ہیں۔

’’دہلی پہنچتے ہی سیدھے قلعے میں گئے اور بہادر شاہ ظفر سے ملاقات کی۔ جنگ کی صورتِ حال کے متعلق گفتگو کی۔ فوجوں کا جائزہ لیا۔ آزادی حاصل کرنے کے لئے جو لوگ کمر کس چکے تھے ان سے ملے اور پھر روہیلوں کے سردار جنرل بخت خان کے پاس گئے......
۱۸۵۹ء میں مولانا فضل حق خیر آبادی کو مغلیہ حکومت کی وفاداری اور انگریزوں کے خلاف بغاوت میں شریک ہونے کے جُرم میں گرفتار کرلیا گیا۔‘‘ (آزادی کے مجاہد از محمود الرحمٰن۔ص ۳۵۔نیشنل بک فاؤنڈیشن کراچی۔۱۹۷۳ء)

پروفیسر محمد ایوب قادری کا ایک مضمون ’’مولانا فضل حق خیر آبادی کو انگریزی لباس اور طرز سے نفرت تھی‘‘۔روزنامہ ’’حریت‘‘ کراچی میں چھپا ہے۔جس میں انھوں نے علامہ فضل حق کے دہلی سے بعد از خرابِ بسیار اودھ پہنچنے کا ذکر کیا ہے۔

’’۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں مولانا فضل حق الور سے دہلی پہنچے اور دہلی سے بعد از خرابِ بسیار اودھ پہنچے۔بیگم حضرت محل کی کورٹ کے ممبر ہوئے۔ بعد ازاں مولانا فضلِ حق گرفتار ہوئے۔ بغاوت کے جرم میں اس یگانۂ روزگار شخصیت پر مقدمہ چلا۔‘‘ (روزنامہ ’’حریّت‘‘، کراچی، ۹ر جولائی ۱۹۷۷ء)

حامد حسن قادری ان کے ’’جُرمِ بغاوت‘‘ کے متعلق لکھتے ہیں:

’’۱۸۵۹ء میں جب غدر کے بعد انگریزوں کا تسلط ہوگیا تو اور لوگوں کے ساتھ مولانا فضل حق پر بھی جرمِ بغاوت عائد کیا گیا اور حبسِ دوام بعبور دریائے شور کا حکم ہوا۔‘‘ داستانِ تاریخِ اردو۔ص ۳۲۹)

علامہ پر قائم کردہ مقدمے کی رپورٹ میں لکھا ہے:

’’یہ بات ان ایام میں عام طور پر مشہور تھی کہ چند آدمی بیگم (حضرت محل) کے مشیرانِ خاص ہیں۔ باغی فوج میں ان کی ’’اربعہ شوریٰ‘‘ کے نام سے شہرت تھی، بلکہ کبھی کبھی انہیں ’’کچھری پارلیمنٹ‘‘ کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔اس شوریٰ میں ملزم (فضل حق) بہت ممتاز تھا۔‘‘

فیصلے میں یہ بھی لکھا ہے:

''وہ خطرناک ترین آدمی ہے جو کسی وقت بھی بے حد نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس لئے انصاف اور امن عامہ کا تقاضا ہے کہ اسے ملک بدر کر دیا جائے۔''

جوڈیشنل کمشنر اودھ اور قائم مقام کمشنر خیر آباد ڈویژن نے ۴ر مارچ ۱۸۵۹ء کو فیصلہ صادر کرتے ہوئے لکھا:

''بغاوت شروع ہونے کے وقت وہ الور میں ملازم تھا۔ یہاں سے دیدہ دانستہ دہلی آیا اور اس کے بعد وہ باغیوں اور بغاوت کے قدم بہ قدم چلتا رہا۔ ایسے شخص کو سخت ترین سزا ملنا چاہیے اور اسے خاص طور سے ہندوستان سے خارج کر دینا چاہیے۔'' (ماہنامہ ''تحریک'' دہلی، جون ۱۹۶۰ء۔ بحوالہ حرفِ آغاز ''باغی ہندوستان'' از محمد عبدالحکیم شرف قادری۔ مطبوعہ، مکتبہ قادریہ، اندرون لوہاری دروازہ لاہور۔ ۱۳۹۴ھ/۱۹۷۴ء)

سید مصطفیٰ علی بریلوی جنگ آزادی کے عظیم رہنماؤں کی فہرست میں مولانا فضل حق کا ذکر یوں کرتے ہیں:

ہماری پہلی جنگِ آزادی کے ہیرو بلاشبہ انگریزی فوجی اور سول افسران سے کسی طرح قابلیت اور حب الوطنی میں کم نہیں تھے۔ جنرل بخت خان، جنرل محمود خان، بیگم حضرت محل، مولانا احمد اللہ شاہ، سید لیاقت علی، مولانا فضل حق، خان بہادر خاں، نانا راؤ، تانتیا ٹوپی، شہزادہ فیروز شاہ، جھانسی کی رانی، محمد علی خان عرف جیمی گرین وغیرہ مجاہدین کے لیڈر تھے اور اپنی اپنی جگہ بڑی بڑی خوبیوں کے لوگ تھے۔'' (مضمون ''جنگ آزادی کی کہانی، انگریزوں کی زبانی'' ماہنامہ ترجمانِ اہل سنت کراچی۔ جنگِ آزادی نمبر۔ ص ۱۰۵۔ شمارہ جولائی ۱۹۷۵ء)

دہلی کے اس دور کا ایک اخبار نویس چُنی لال ۱۹ر مئی ۱۸۵۷ء کو یہ خبر دیتا ہے:

''علمائے دین نے تمام شہر کے مسلمانوں کو جمع کر کے انگریزوں سے جہاد کرنے کی ترغیب دی اور کہا کہ کفار کو قتل کرنے سے اجر عظیم ملتا ہے۔

ہزاروں مسلمان ان کے عَلَم کے نیچے جمع ہو گئے۔'' (''بہادر شاہ'' کا مقدمہ۔ ص ۱۱۷)

اس قسم کے متعدد جلسے ان علما نے مسجدوں خصوصاً جامع مسجد دہلی میں کیے اور ان میں مولانا فضل حق خیرآبادی اپنی پُر جوش تقریروں سے مسلمانوں میں جوش جہاد پیدا کرتے رہے۔ چنانچہ یہی چُنی لال لکھتا ہے:

''مولوی فضل حق اپنے مواعظ سے عوام کو مسلسل بھڑکا رہے ہیں۔''

(اخبار دہلی، از چُنی لال، ص ۲۷۳، فائل ۱۲۷۔ بحوالہ ''فضل حق خیرآبادی اور سن ستاون'' از حکیم محمود احمد برکاتی۔ ص ۴۸۔ مطبوعہ برکات اکیڈمی، لیاقت آباد، کراچی۔ ۱۹۷۵ء)

اودھ کے چیف کمشنر کا سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا کے سکریٹری کے نام ۱۱ر دسمبر ۱۸۵۸ء کو ایک سرکاری مراسلے میں لکھتا ہے:

''مندرجہ ذیل لوگوں کے چلے جانے کے بعد حکومت کو قیام امن میں کافی سہولت ہو رہی ہے۔ فیروز شاہ، لکڑ شاہ، مولوی فضل حق جو ہماری حکومت کا دشمنِ جاں ہے، حالاں کہ حکومت نے اسے اور اس کے اعزہ کو اعلیٰ مناصب عطا کیے تھے۔'' (فضل حق خیرآبادی اور سن ستاون۔ ص ۸۸، ۸۷۔ مؤلفہ حکیم محمود احمد برکاتی)

بہادر شاہ ظفر سے علامہ فضل حق کی ملاقاتوں کا مقصد جنگ آزادی کو تیز تر کرنا تھا۔ انھوں نے بادشاہ کو فعال کرنے کی کوشش کی۔ مجاہدین کی سرپرستی کی اہمیت جتائی اور دوسرے مناسب مشورے دیئے:

''......ان حالات میں تحریک کی کامیابی کے امکانات کا دھندلا جانا لازمی ہے۔ مولانا نے اس اہم مسئلے پر پہلے دن سے توجہ دی اور بہادر شاہ سے اپنی پہلی ملاقات میں اس پر زور دیا کہ مجاہدین کی روپیہ اور سامانِ رسد سے مدد کرنا نہایت ضروری ہے۔

حکیم احسن اللہ خاں نے لکھا ہے کہ مولوی صاحب جب بھی بادشاہ سے ملتے، بادشاہ کو مشورہ دیتے کہ جنگ کے سلسلے میں رعایا کی ہمت افزائی کریں اور ان کے ساتھ باہر (محاذ پر) نکلیں اور دستوں کو جس حد تک ممکن ہو، بہتر معاوضہ دیں۔'' (میموریز۔ ص ۲۴، ۲۳۔ فضل حق خیرآبادی اور سن

ستاون، ص ۵۰،۴۹)

علامہ فضل حق نے صرف بہادر شاہ اور بخت خان سے ملنے اور انہیں مشورہ دینے ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ شاہ نے جو ''کنگ کونسل'' تشکیل دی تھی۔ علامہ اس کے بھی بڑے اہم رُکن تھے۔

''سید مبارک شاہ (جو دوران غدر دہلی کا کوتوال رہا تھا) کا بیان ہے کہ بہادر شاہ نے جنرل بخت خاں، مولوی سرفراز علی اور مولوی فضل حق پر مشتمل ایک کنگ کونسل تشکیل دی تھی۔ مبارک شاہ ہی نے ایک جگہ اس کو ''پریوی کونسل'' بھی لکھا ہے۔''

The Great Revolution of 1857

(از ڈاکٹر سید معین الحق (کراچی)۔ ص ۱۲۸۔۱۸۳)

سوویت یونین کی سائنس اکیڈمی کے ادارۂ علومِ شرقیہ کی ایک ممتاز رکن مادام پولونسکایا ایک مضمون میں لکھتی ہیں:

''مولانا (فضل حق) الور تشریف لائے جہاں انھوں نے انگریزوں کے خلاف ایک مسلح بغاوت کا پرچار کیا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ وہ زمیندار جو برطانوی حکومت سے مطمئن نہیں ہیں، اس کی بنیادی طاقت ہوں گے۔ مولانا موصوف کے معاصرین اور ان کے سوانح نگاروں نے ان کے بہت سے خطوط کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے مختلف ریاستوں کے حکمرانوں کو لکھے تھے۔ انھوں نے برطانیہ کے خلاف ایک مسلح بغاوت کا پیغام دیا تھا۔ بغاوت کے زمانے میں مولانا انگریزوں کے مخالفوں کی صف میں رہے......

مولانا فضل حق خیرآبادی کے سماجی اور سیاسی نظریات سامراجی محکومی کے جوئے سے ملک کو آزاد کرنے کی اس خواہش کے آئینہ دار تھے جو پوری قوم کے سینے میں پروان چڑھ رہی تھی۔ اس حیثیت سے ان کی جملہ سرگرمیاں ہندوستان کے قومی مفاد کو پورا کرتی تھیں۔'' (پندرہ روزہ ''سوویت دیس''، دہلی۔ ۱۰/ جولائی ۱۹۵۸ء)

ڈاکٹر مہدی حسین لکھتے ہیں:

''اگر جیون لال کے بیان پر اعتماد کیا جا سکتا ہے تو مولوی فضل حق نے شاہی فوج کی کمان بھی کی ہے۔'' (بہادر شاہ دوم۔ ص۳۹۱۔ بحوالہ فضل حق خیرآبادی اور سن ستاون۔ ص۵۲،۵۱۔ مؤلفہ حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی۔ مطبوعہ کراچی ۱۹۷۵ء)

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخونِ دل
قانونِ باغبانیِ صحرا نوشتہ ایم

(ملخص۔ ص۲۶ تا ص۵۰۔ امتیاز حق مؤلفہ راجہ غلام محمد لاہوری۔ طبع پنجم المجمع الاسلامی مبارک پور ۱۴۲۵ھ/۲۰۰۴ء۔ طبع اول مکتبہ قادریہ لاہور ۱۳۹۸ھ/۱۹۷۸ء)

☆☆☆☆☆☆☆

انقلاب کی کہانی! قائدِ انقلاب کی زبانی

"الثورۃ الھند" اور "قصائد فتنۃ الھند" (قصیدۂ ہمزہ ودالیہ) تاریخ انقلاب کے مستند حقائق و واقعات وتأثرات وحالات پر مشتمل وہ اجمالی دستاویز ہے جو انقلاب ۱۸۵۷ء میں شریک بلکہ اس کے اہم ترین قائد علامہ فضل حق خیرآبادی کے زرخیز ذہن اور فکر انگیز قلم کا ایک نادر اور معیاری نمونہ ہے۔

مولانا عبدالشاہد شیروانی علی گڑھی سابق اسسٹنٹ لائبریرین شعبۂ مخطوطات مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ (متولد جنوری 1915ء۔ متوفی ۱۴ر جمادی الاولیٰ ۱۴۰۴ھ مطابق ۱۸ر فروری ۱۹۸۴ء) نے پہلی بار الثورۃ الھندیۃ (منثور) اور قصائد فتنۃ الھند (منظوم) کا اردو ترجمہ کرکے اسے اپنی تاریخی کتاب ''باغی ہندوستان'' میں مع عربی متن شامل کیا جو اس کتاب کا اصل سرمایہ ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے مقدمہ کے ساتھ مدینہ پریس بجنور سے ۱۹۴۷ء میں اس کی پہلی طباعت واشاعت ہوئی۔

باغی ہندوستان مؤلفہ عبدالشاہد شیروانی کے طبع چہارم (مبارک پور اعظم گڑھ ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء) کی تقدیم میں مولانا سید نجم الحسن رضوی خیرآبادی لکھتے ہیں۔

''راقم السطور نے الثورۃ الھندیۃ کی زیارت سب سے پہلے استاد محترم مولانا معین الدین اجمیری (شاگرد رشید حکیم سید برکات احمد ٹونکی) کے کتب خانہ میں کی تھی۔ یہ نسخہ بخطِ نسخ مولانا نے خود نقل کیا تھا اور لغت کی کتابوں کی مدد سے حلِ لغات کیا تھا۔ موصوف کا ارادہ یہ تھا کہ عربی ادب میں استعداد پیدا کرنے کے لئے مجھ کو اور مولوی عبدالشاہد شیروانی کو سبقاً سبقاً پڑھادیں لیکن دوسری کتابوں کا بار اتنا تھا کہ اس کی نوبت نہ آسکی۔ بعد میں یہ نسخہ استاذِ محترم نے شاہد میاں کو دے دیا تھا۔ (ص ۷۔ تقدیم باغی ہندوستان طبع چہارم مبارک پور ۱۹۸۵ء)

مولانا عبدالشاہد شیروانی نے ۱۹۴۵ء میں الثورۃ اور قصائد کا عربی سے اردو ترجمہ کیا تھا۔ اسی درمیان انھیں ایک اور نسخہ دست یاب ہوا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''ایک نسخہ مولانا ہدایت اللہ خاں جون پوری شاگرد رشید علامہ فضل حق خیر آبادی کے دستِ مبارک کا لکھا ہوا بھی دست یاب ہو گیا۔ یہ نسخہ مولانا سید سلیمان اشرف صاحب سابق صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (شاگرد مولانا ہدایت اللہ جون پوری) کی دوسری مخصوص کتابوں کے ساتھ حبیب گنج (علی گڑھ) پہنچ گیا تھا۔ جو کتابت کے لحاظ سے دوسرے نسخوں سے قدیم و صحیح ثابت ہوا۔ (ص ۱۸۔ مقدمۂ طبع اول باغی ہندوستان)

ایک جگہ مزید تفصیل کے ساتھ لکھتے ہیں:

۳۶ اور ۴۲، اوراق کے دو قصیدے اور قصائد فتنۃ الہند سبحان اللہ اورینٹل کلکشن، لٹن لائبریری، مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ہیں۔ دو بیاضیں مولوی شاہ ولایت احمد لاہر پوری سجادہ نشین آستانہ قلندریہ کے کتاب خانہ میں اور کلام کا کچھ حصہ جس میں اصل مسودہ بھی شامل ہے کتاب خانہ مفتیانِ گوپامئو میں ہے۔

ایک نامکمل بیاض جس میں عربی میں مختلف بزرگوں اور دوستوں کے نام چھ خطوط اور پندرہ طویل قصیدے ہیں جن میں اکثر مکمل اور بعض نامکمل ہیں محبِ محترم مولوی نصیر الدین اجمیری برادر زادۂ مولانا معین الدین اجمیری کے پاس ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ بعض قصائد و خطوط خود علامہ ہی کے دستِ مبارک کے لکھے ہوئے ہیں۔ کئی جگہ دستخط بھی ثبت ہیں۔ اس بیاض کی نقل اور رسالہ الثورۃ الھندیۃ مع قصائد فتنۃ الہند حضرت الاستاذ علامہ معین الدین اجمیری کے ہاتھ کے لکھے ہوئے میرے پاس بھی ہیں۔

رسالہ ''الثورۃ الھندیۃ'' مع ''قصائد فتنۃ الہند'' کتاب خانہ حبیب گنج (علی گڑھ) کتاب خانہ ٹونک اور کتاب خانہ مولوی سید نجم الحسن رضوی خیر آبادی میں بھی موجود ہے۔ (حاشیہ۔ ص ۱۶۵۔ طبع چہارم باغی ہندوستان)

یہ رسالہ جزیرۂ انڈمان سے ہندوستان کس طرح پہنچا؟ اس تعلق سے مولانا شیروانی لکھتے ہیں:

''جب حضرت مولانا مفتی عنایت احمد کاکوروی (استاذِ مفتی لطف اللہ علی گڑھی) ایک انگریز افسر کی فرمائش پر ''تقویم البلدان'' کا ترجمہ کر کے ۱۲۷۷ھ/ ۱۸۶۰ء میں رہائی پا کر عازم ہندوستان ہوئے تو یہ رسالہ علامہ فضل حق خیر آبادی نے اپنے خلف الرشید مولانا عبد الحق خیر آبادی کے پاس مختلف کاغذ کے پرزوں اور کپڑوں پر کوئلہ وغیرہ سے لکھ کر بھیج دیا تھا۔ اسی رسالہ کے ساتھ قصائد فتنۃ الہند بھی تھے۔

مولانا عبدالحق خیرآبادی نے بڑی محنت و کاوش سے اسے مرتب کیا اور چند مخلصین و معتقدین نے اس کی نقلیں حرزِ جاں بنا کر اپنے پاس رکھیں۔اس طرح اس کے نسخے خاص خاص حضرات کے پاس محفوظ ہوگئے۔حکومت کے خوف سے کسی نے اس کے عام کرنے کی کوشش نہ کی نہ کوئی چھپوانے کی جرأت کرسکا۔میرے استاذ محترم مولانا معین الدین اجمیری (۱۲۹۹ھ۔۱۳۵۹ھ) نے کئی بار ارادۂ اشاعت کیا لیکن کل امر مرھونٌ باوقاتھا کے مطابق پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔(ص۱۶۔مقدمہ طبع اول باغی ہندوستان)

''رسالہ مع قصائد علامہ نے مفتی عنایت احمد کاکوروی کے ذریعہ ۱۲۷۷ھ میں خلف الصدق مولانا عبدالحق کے پاس بھیجا تھا کہ ابّن میاں کو جا کر یہ تحفہ دے دینا۔پنسل اور کوئلہ سے لکھے ہوئے مختلف پرچے تھے جن کو کئی ماہ کی محنت کے بعد (مولانا عبدالحق) درست اور مرتب کر پائے تھے۔(ص۲۲۶۔باغی ہندوستان۔طبع چہارم)

قصائد فتنۃ الهند (قصیدۂ ہمزیہ ودالیہ) زیرِ نظر کتاب (قائد جنگِ آزادی) میں شامل نہیں ہے۔الثورۃ اور قصائد مع اصل عربی اور اردو ترجمہ کے مطالعہ کی ضرورت جو قارئین کرام محسوس کریں وہ باغی ہندوستان مؤلفہ عبدالشاہد شیروانی مطبوعہ لاہور و مبارک پور کی طرف رجوع کریں۔باغی ہندوستان میں یہ دونوں چیزیں وہاں ایک ساتھ مطالعہ کی جاسکتی ہیں۔

علامہ فضل حق خیرآبادی قصائد فتنۃ الهند کے آخر میں لکھتے ہیں:

> قد تمتِ القصیدتان فی شهر رجب سنة ۱۲۷۶ھ۔ یعنی الفاً و مائتین و ستاً و سبعین من الهجرة النبویة علیٰ صاحبها ازکی الصلوٰة و التحیة۔
>
> وانا محبوس فی الجزیرة الوبیة۔ نجانی الله سبحٰنه منها برحمتهِ الوسیعة و قدرتهِ البدیعة۔ بجاهِ حبیبهٖ و الهٖ و عِترتهٖ، علیه و علیهم ازکیٰ الصلوٰت و اسنیٰ التسلیمات۔
>
> (ص۱۸۸۔ باغی هندوستان)

مولانا ابوالکلام آزاد الثورة الهندیة کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مولانا فضل حق رحمۃ اللہ علیہ کا یہ رسالہ اہل علم میں متداول تھا لیکن آج تک اس کی

طباعت کا سروسامان نہ ہوسکا............غدر کے حوادث کا تذکرہ اور پھر ایسے شخص کی زبانی جسے بجرمِ بغاوت مدۃ العمر قید کی سزادی گئی تھی۔ زیادہ سے زیادہ خطرناک یقین کی جاتی تھی۔
والد مرحوم (مولانا خیرالدین دہلوی) نے معقولات کی تکمیل مولانا (فضل حق) مرحوم کی خدمت میں کی تھی اس لئے ان کی مصنّفات اور حالات سے خاص علاقہ رکھتے تھے۔ مولانا کے فرزند مولانا عبدالحق مرحوم نے یہ رسالہ خود اپنے قلم سے نقل کرکے والد مرحوم کو مکہ معظّمہ بھیجا تھا۔ چنانچہ وہ میرے کتب خانہ میں موجود ہے۔
مولوی عبدالشاہد صاحب شیروانی نے جب مجھ سے اس رسالہ کی تصحیح واشاعت کے ارادہ کا ذکر کیا تو مجھے نہایت خوشی ہوئی۔ اب ان کی کوشش سے نہ صرف اصل رسالہ پہلی مرتبہ شائع ہورہا ہے بلکہ اس کا اردو ترجمہ بھی مہیا ہوگیا ہے۔ ترجمہ میں نے مختلف مقامات سے دیکھا۔ سلیس اور شگفتہ عبارت میں کیا گیا ہے اور اصل کی لفظی رعایت کے ساتھ اسلوب بیان کی شگفتگی اور روانی بھی ملحوظ رکھی گئی ہے۔ امید ہے کہ عزیز موصوف کی یہ سعی مشکور ہوگی اور رسالہ عام طور پر مقبول ہوگا۔
ابوالکلام۔ دہلی ۲۱/اگست ۱۹۴۶ء
(ص ۲۳۔ باغی ہندوستان مؤلفہ عبدالشاہد شیروانی)
ڈاکٹر سید معین الحق (کراچی) نے The Story of the War of Indepence کے نام سے الثورۃ الھندیہ کا انگریزی ترجمہ کردیا ہے جو جلد پنجم جزء اول پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی میں شایع ہوچکا ہے۔
اب قارئین کرام الثورۃ الھندیہ از علامہ فضل حق خیرآبادی کا اردو ترجمہ ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمام ثنائیں اس خدائے برتر کے لئے ہیں جس سے بغیر کسی ناامیدی کے، محنت وآزمائش، کہنگی وبوسیدگی اور غم وتکلیف سے نجات دینے کی بہت بڑی امید وابستہ ہے۔ اور جو اسے اس کے اعلیٰ نام سے پکارے اسے بہترین عطایا اور بیشمار نعمتیں عطا فرمانے والا ہے۔ بالخصوص مظلوم ومضطر کی، اس کی مصیبتوں اور بیماریوں میں سننے والا ہے۔
سلام ہو اس خوش رو، خوش خبری سنانے والے اور ڈرانے والے پر جس کی تمام انبیاے کرام

نوید مسرت آمد سناتے آئے۔ بلا و وباء کے دور کرنے، دشمنوں کے ظلم کے پردے چاک کرنے، بڑی بد بختی اور سخت بیماری سے نجات دلانے کی، گنہگاروں اور سیہ کاروں کو، اس کی شفاعت سے بڑی امید ہے۔

سلام ہو اس کی شریف و نجیب و کریم اولاد اور اس کے عظیم المرتبہ، شدید و رحیم اصحاب پر۔ خصوصاً پاکباز و صاف باطن خلفا پر۔ اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ان سب پر نازل ہوں جب تک فرشتے آسمان پر تسبیح و تہلیل کرتے رہیں۔ اور کشتیاں سمندر میں تیرتی رہیں۔

میری یہ کتاب، ایک دل شکستہ، نقصان رسیدہ، حسرت کشیدہ اور مصیبت زدہ انسان کی کتاب ہے۔ جو اَب تھوڑی سی تکلیف (جھیلنے) کی بھی طاقت نہیں رکھتا۔ اپنے رب سے جس پر سب کچھ آسان ہے، مصیبت سے نجات کا امیدوار ہے۔

جو ابتدائے عمر سے عیش و فراغت کی زندگی بسر کرنے کے باوجود، اب محبوسِ دام ظلم اور تباہ شدہ ہے اور مقبول دعاؤں کے ذریعہ خدا سے ازالۂ کرب کا طالب ہے۔ وہ بڑی مشکلات میں مبتلا اور ترش رو ظالموں کے ہاتھوں میں گرفتار ہے۔ ان ظالموں نے اسے اچھے لباس سے معرا کر کے غم و حزن کی وادیوں اور ایسے تنگ و تاریک قید خانوں میں ڈال دیا ہے جو سیاہ فتنوں کے مرکز ہیں۔

وہ محبوس و حزیں، سخت دل، اچکّے، اور ظالم افراد پر نظر کرتے ہوئے اپنی رہائی سے مایوس ہے مگر اللہ کی رحمت سے نا امید نہیں ہے۔ وہ ایک سیدھا سادھا، نرم خو اور مریض و کمزور ہوتے ہوئے، شریر و بد فطرت کی قید میں ہے۔ اور ظالم و جابر، بد خلق و بد کردار کے مظالم سے حیران و پریشان ہے۔ وہ آفت رسیدہ، ایسے مصائب میں مبتلا ہے جن کی سختیوں تک قیاس کرنے والے کا قیاس نہیں پہنچ سکتا۔ اور ایسا مضطر و محتاج ہے جو سخت عذاب و احتباس میں گرفتار ہو چکا ہے۔ وہ سفید رو، سیاہ دل، متلون مزاج، ترش رو، کنجی آنکھ، گندم گوں بال والوں کی قید میں آچکا ہے۔ جس کا اپنا عمدہ لباس اتار کر موٹا اور سخت لبادہ پہنا دیا گیا ہے۔ جو اس وقت مجبور و عاجز ہے اور اپنے رب سے لو لگائے ہوئے ہے۔

اپنے تمام اعزہ و اقارب سے دور اور بہت دور ہے۔ مدعی اور منازع کے بغیر اس پر فیصلہ صادر کر دیا گیا ہے۔ وہ اپنے ہم نشینوں اور خادموں کے سامنے شرمندہ ہے۔ اس کے بازوؤں کو سخت تصادم سے کمزور کر دیا گیا ہے۔ وہ غمزدہ، تنہا اور دور افتادہ ہے۔ اسے اپنی زمین و شہر سے

جلاوطن اور اہل دعیال سے دور کر دیا گیا ہے۔ یہ سارا ظلم وستم، ظالم بدکیش نے روا رکھا ہے۔ا
سے اور اس کے اہل وعیال کو اپنی درندگی کی جھاڑی میں چھوڑ دیا ہے۔اسے قید کر کے ہر ممکن
مصیبت پہنچائی گئی ہے۔اس کا قصور، صرف ایمان اور اسلام پر مضبوطی سے قائم رہنا اور
علمائے اَعلام میں شمار ہونا ہے۔

اس سے ان ظالموں کا مقصد نشانِ درس وتدریس کو مٹانا اور علم کے جھنڈے کو نیچے گرانا
ہے۔وہ صفحات قرطاس سے بھی نام ونشان مٹانا چاہتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس حادثہ فاجعہ
(انقلاب ۱۸۵۷ء۔شاہد شیروانی) کی وجہ سے ہوا ہے۔جس نے آبادیوں کو ویران، اور مصیبتوں
کی شورزمین کو شاداب بنادیا ہے۔جس سے غموں کے بادلوں سے کڑکتی ہوئی بجلیاں، مصیبت
زدگانِ وطن پر گریں۔اور ان پر بادشاہوں کو غلام وقیدی اور امراء کو محتاج وفقیر بنانے والی محتاجی
وناداری مسلط کر گئی۔

یہ داستانِ الم اس طرح ہے کہ وہ برطانوی نصاریٰ جن کے دل ممالکِ ہند کے دیہات
وبلاد پر قبضہ، اور اس کے اطراف واکناف وسرحدات پر تسلّط کے بعد عداوت وکینہ سے بھر گئے
تھے۔اور تمام ذی عزت اَعیان کو ذلیل وخوار کر کے ان میں سے ایک کو بھی اس قابل نہ چھوڑا تھا
کہ سرِ نافرمانی کو جنبش دے سکے۔

انھوں نے تمام باشندگانِ ہند کو، کیا امیر کیا غریب، چھوٹے بڑے، مقیم ومسافر، شہری
ودیہاتی سب کو نصرانی بنانے کی اسکیم بنائی۔ان کا خیال تھا کہ ان کو نہ تو کوئی مددگار ومعاون
نصیب ہو سکے گا اور نہ انقیاد واطاعت کے سوا سرتابی کی جرأت ہو سکے گی۔

یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ سب لوگ انھیں کی طرح ملحد وبے دین ہو کر ایک ہی ملّت پر جمع
ہو جائیں۔اور کوئی بھی ایک دوسرے سے ممتاز فرقہ نہ رہ سکے۔انھوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا
کہ مذہبی بنیاد پر حکمرانوں سے باشندوں کا اختلاف، تسلط وقبضہ کی راہ میں سنگِ گراں ثابت
ہوگا۔اور سلطنت میں انقلاب پیدا کر دے گا۔اس لئے پوری جاں فشانی اور تن دہی کے ساتھ
مذہب وملت کے مٹانے کے لئے طرح طرح کے مکروحیلہ سے کام لینا شروع کیا۔انھوں نے
بچوں اور نافہموں کی تعلیم اور اپنی زبان ودین کی تلقین کے لئے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم
کیے۔پچھلے زمانے کے علوم ومعارف اور مدارس ومکاتب کے مٹانے کی پوری کوشش کی۔

دوسری ترکیب یہ سوچی کہ مختلف طبقوں پر قابو اس طرح حاصل کیا جائے کہ زمینِ ہند کے غلہ کی پیداوار، کاشتکاروں سے لے کر نقد دام ادا کیے جائیں۔ اور ان غریبوں کو خرید و فروخت کا کوئی حق نہ چھوڑا جائے۔ اس طرح بھاؤ کے گھٹانے بڑھانے، اور منڈیوں تک اجناس پہنچانے اور نہ پہنچانے کے وہ خود ہی ذمہ دار بن بیٹھیں۔ اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ خدا کی مخلوق مجبور و معذور ہو کر ان کے قدموں میں آپڑے۔ اور خوراک نہ ملنے پر ان نصاریٰ اور ان کے اعوان و انصار کے ہر حکم کی تعمیل اور ہر مقصد کی تکمیل کرے۔

ان ترکیبوں کے علاوہ ان کے دل میں اور بھی بہت سے مفاسد چھپے ہوئے تھے۔ مثلاً مسلمانوں کو ختنہ کرانے سے روکنا، شریف و پردہ نشیں خواتین کا پردہ ختم کرانا۔ نیز دوسرے احکامِ دین مبین کو مٹانا۔ وغیر ذالک۔

اپنے مکر کی ابتدا اس طرح کی کہ سب سے پہلے اپنے ہندو مسلم لشکریوں کو ان کے رسوم واصول سے ہٹانے اور مذہب وعقائد سے گمراہ کرنے کے درپے ہوئے۔ ان کا گمان تھا کہ جب بہادر لشکری اپنے دین کو بدلنے اور احکامِ نصرانیت بجالانے پر آمادہ ہو جائیں گے تو پھر دوسرے باشندوں کو سزا و عقاب کے ڈر سے خود ہی مجالِ انکار نہ ہو سکے گی۔

انھوں نے ہندو لشکر کو جو تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ گائے کی چربی اور مسلمان سپاہیوں کو جو تھوڑی تعداد میں تھے سوّر کی چربی چکھانے پر زور ڈالا۔ یہ شرمناک روش دیکھ کر دونوں فرقوں میں اضطراب پیدا ہو گیا اور اپنے اپنے مذہب واعتقاد کی حفاظت کی خاطر ان کی اطاعت وانقیاد سے منھ موڑ لیا۔ ان کے اس اضطراب نے خرمنِ امن پر چنگاری کا کام کیا۔ گروہِ نصاریٰ کا قتل، ڈاکہ زنی، ان کے سرداروں اور سپہ سالاروں پر حملہ شروع کر دیا۔ بعض لشکری حد سے تجاوز کر گئے۔ انھوں نے قساوت قلبی اور شوریدہ سری کا انتہائی مظاہرہ کیا۔ بچّوں اور عورتوں کے قتل سے بھی دریغ نہ کیا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں اور بے گناہ عورتوں کے قتل وغارت گری سے رسوائی و ذلّت کے مستحق بن بیٹھے۔۔ پھر تمام "باغی"، گروہِ لشکریاں، اپنی چھاؤنیوں سے، اپنے افسروں سے نبٹنے کے بعد چل کھڑے ہوئے۔ عاملوں اور حاکموں کے نظام درہم برہم ہو گئے۔ راستوں کے امن میں خلل وفتور، مخلوق خدا میں فتنہ وفساد، اور دیہات وبلاد مین شور وشغب پھیل گیا۔ طوفانِ حوادث جوش میں آ گیا۔

بہت سے لشکر شہر مشہور، بلد معمور، مسکنِ آلِ تیمور، دارالسلطنت دہلی جا پہونچے۔ وہاں پہنچ کران سب نے ایسے شخص کو سردار و پیشوا بنالیا جو اس سے پہلے بھی ان کا آمرو حاکم (بہادر شاہ ظفر۔شاہد شیروانی) تھا۔ جس کے پاس اس کے ارکانِ دولت اور وزیر بھی تھے لیکن وہ خود ضعیف، غمزدہ اور نا تجربہ کار تھا۔ عمر کی کافی منزلیں طے کر کے بڑھاپے کی وادی میں قدم رکھ چکا تھا۔ اور سچ پوچھیے تو آمرو حاکم ہونے کے بجائے اپنی شریک حیات (ملکہ زینت محل۔شاہد شیروانی) اور وزیر (حکیم احسن اللہ خاں۔شاہد شیروانی) کا مامور و محکوم تھا۔ اس کا یہ وزیر جو حقیقت میں نصاریٰ کا کارپرداز، اور ان کی محبت میں غالی تھا صحیح معنوں میں حاکم ووالی اور نصاریٰ کے دشمنوں کا شدید ترین مخالف تھا۔ یہی اس آمرو حاکم کے اہل خاندان کا حال تھا۔ ان میں سے بعض مقرب بارگاہ اور رازدار (شہزادہ مرزا مغل وغیرہ، شاہد شیروانی) بھی تھے۔ یہ سب کے سب جو جی چاہتا تھا کرتے تھے۔ اور وہ سردار ایسا ضعیف الرائے نا تجربہ کار تھا کہ کچھ جانتا ہی نہ تھا۔ اس سے عجیب عجیب حرکتیں سرزد ہوتی تھیں۔ کوئی کام اپنی رائے سے نہ کر سکتا تھا۔ نہ کسی کو خفیہ یا علی الاعلان کوئی حکم دے سکتا تھا۔ نہ کسی کو نفع وضرر پہنچانے کی طاقت رکھتا تھا۔

یہ تو سب کچھ ہو ہی رہا تھا کہ بعض شہر و دیہہ سے بہادر مسلمانوں کی ایک جماعت (مولوی ابوسعید وغیرہم مستفتی، نور جمال مجیب، توثیق کنندگان ۳۳ علما۔شاہد شیروانی) علماء وزہّاد اور ائمۂ اجتہاد سے جہاد کے وجوب کا فتویٰ لے کر، جدال وقتال کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

ادھر اس نا تجربہ کار سردار نے اپنے بعض ناعاقبت اندیش، سفیہہ، خائن اور بزدل اولاد (مرزا مغل وخضر سلطان وغیرہما۔شاہد شیروانی) کو امیر لشکر بنادیا۔ یہ لوگ دیانتدار عقلمندوں سے متنفر تھے۔ انھیں نہ تو میدان کارزار ہی سے کبھی واسطہ پڑا تھا اور نہ کبھی شمشیر زنی اور نیزہ بازی کا ہی موقع ہوا تھا۔ انھوں نے بازاری لوگوں کو اپنا ہمنشین وجلیس بنالیا۔ اس طرح یہ نا آموزدہ کار، آرام طلبی، اسراف اور فسق وفجور میں مبتلا ہو گئے۔

وہ تنگدست ہو چکے تھے پھر مالدار ہو گئے۔ جب مال دار ہو گئے تو عیش پرستیوں میں پڑ گئے۔ لوگوں سے لشکروں کے ساز وسامان کے بہانے سے کافی مقدار میں مال جمع کرتے تھے۔ اور اس میں سے ایک حبّہ بھی کسی لشکری پر خرچ نہ کرتے تھے۔ جو کچھ وصول کرتے تھے خود کھا جاتے تھے۔ یہاں تک بھی غنیمت تھا۔ لیکن ان کو تو زنانِ فاحشہ وتباہ کار نے طلایہ کی قیادت، اور

کنیزوں کی شب باشی نے لشکروں کے ساتھ رات کو چلنے سے روک دیا۔ اور آلاتِ عیش وطرب نے آرام طلبی میں ڈال کر مقدمہ الجیش سے بھی پیچھے کردیا۔ ان کے دلوں میں نامردی اور ذلیل اندیشہ بیٹھ گیا۔ اسی نے ان کو وسطِ لشکر میں ثابت قدمی سے روکا۔ اور شومیِ قسمت نے میمنہ سے اور قمار وتونگری نے میسرہ سے باز رکھا۔ ان کے خوشامدی اور بازاری ہم صحبتوں نے ساقہ (پچھلا) سے بھی علیحدہ رکھا۔

ایسا ہی ہوا کرتا ہے جب کسی نااہل کو کوئی بڑا کام سپرد کیا جاتا ہے۔ اور کمزور پر بھاری بوجھ لادا جاتا ہے۔ وہ رات سوکر اور دن بدمست ہوکر گذارتے۔ جب بیدار و ہوشیار ہوتے تو غافل و حیران پھرتے۔ نوبت بایں جا رسید کہ نصاریٰ کا لشکر ان پر آکر ٹوٹ پڑا۔

ایک بلند پہاڑی (پہاڑی دھیرج۔ شاہد شیروانی) پر چڑھ کر شہر کا رخ کردیا۔ شہر کا محاصرہ کر کے خندقیں کھود ڈالیں۔ پہاڑی پر توپیں اور منجنیقیں نصب کر کے شہر پناہ اور مکانات پر گولہ باری شروع کردی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بجلیاں اور تارے ٹوٹ ٹوٹ کر عمارتوں پر گر رہے ہیں۔

ہندوستانیوں کا برسرِ پیکار اور ''باغی'' لشکر مختلف ٹولیوں میں تقسیم تھا۔ بعض گروہ کا کوئی جنرل ہی نہ تھا۔ بعض کو جائے پناہ بھی میسر نہ تھی۔ بعض کی طاقت فقر وفاقہ نے سلب کر کے ہاتھ پاؤں توڑ کر بٹھا دیا تھا۔ کچھ تھوڑا سا مالِ غنیمت ہاتھ لگنے سے بے نیاز ہوگئے تھے۔ کچھ ترساں ولرزاں قلب کے ساتھ بھاگ چھوٹے تھے۔ بعض طغیان وسرکشی سے بدکار عورتوں پر قبضہ جما بیٹھے۔ بعض نے میدان جہاد کے تنگ وسخت فوجی کپڑے پہن کو صفوفِ جنگ میں داخل ہونے کو بُرا جانا۔ صرف ایک گروہ نصاریٰ کا جواب دیتے ہوئے بہادری سے لڑتا رہا۔

نصاریٰ جب لڑتے لڑتے تھک گئے اور پست ہوگئے تو غربی ہندوؤں سے مدد و معاونت کے طالب ہوئے۔ ہندوؤں نے کثیر لشکر اور ساز وسامانِ حرب سے تھوڑی سی مدت میں پے در پے مدد کی تب نصاریٰ نے سخت لڑائی ٹھان دی۔ اور اس پہاڑی پر بہت سا لشکر اور مددگار و معاون جمع کرلیے۔ ان کے لشکریوں میں گورے منھ کے گروہ بھی تھے۔ اور ذلیل ترین ہندو اجیر بھی۔ اور وہ بدبخت و بدکیش مسلمان بھی جو ایمان کے بعد نصاریٰ کی محبت میں مرتد ہوکر اپنے دین کو چند ٹکوں کے بالعوض بیچ چکے تھے۔

ہزاروں شہری بھی نصاریٰ کی محبت کا دم بھرنے لگے۔ اور تمام ہندو ان کے ساتھی ہوگئے۔

مسلمانوں میں دو گروہ بن گئے۔ایک گروہ تو ان (غیر ملکیوں) کا جانی دشمن تھا۔دوسرا گروہ ان کی محبت میں اس درجہ غلو رکھتا تھا کہ اس نے ہندوستانی لشکر کی بربادی، مجاہدین کی شوکت و وقار کی خواری اور ان کے قلع وقمع کرنے میں مکر وحیلہ سے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ان کے اندر افتراق و انشقاق پھیلانا ان کا دلچسپ مشغلہ تھا۔

پھر تو نصاریٰ شہر اور اس کے پھاٹکوں، دربانوں اور محافظوں پر حملے کرنے لگے۔ادھر جماعت مجاہدین اور لشکریوں کے ایک بہادر گروہ نے ان کے حملوں کو روکنا اور ان کے مقاصد میں حائل ہونا اپنے لئے اہم ترین فرض قرار دیا۔دن رات پیدل اور سوار دادِ شجاعت دینے لگے۔

چار (مئی ۱۸۵۷ء سے ستمبر ۱۸۵۷ء تک۔شاہد شیروانی) مہینے تک متواتر جنگ ہوتی رہی۔ دشمن اس مدت میں کثیر لاؤ لشکر، اور ساز وسامان کے باوجود شہر میں داخل نہ سکا۔جب بھی حملہ کرتے تھے روکے جاتے تھے۔جس وقت اقدام کرتے تھے لوٹائے جاتے تھے۔بہادر اور نگہبان غازی بڑے زور شور سے یلغار کو روک رہے تھے۔مدافعت و مبارزت میں خوب خوب جوہر دکھا رہے تھے۔مقابلے میں ثابت قدم تھے اور ہر پیش قدمی کرنے والے پر آگے بڑھ کر حملہ آور تھے۔ان میں سے بہت سے جامِ شہادت پی کر سعادت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوئے۔

''نیکو کاروں کے لئے بہشت، حوریں اور اس سے بڑھ چڑھ کر بھی نعمتیں ہیں۔''

اب مجاہدین کی ایک مختصر جماعت باقی رہ گئی جو بھوک پیاس برداشت کر کے رات گذارتی اور صبح ہوتے ہی دشمن کے مقابلہ پر ڈٹ کر نبرد آزما ہوتی۔لشکریوں کی ایک جماعت کے ساتھ مل کر یہی شہر پناہ کی حفاظت، اور شہری سرحدوں کی نگہداشت کرتی۔

بدقسمتی سے ایک شب کو پہاڑی کی محاذی کمین گاہ پر ایک عیش پرست، بزدل اور کسل مند جماعت مقرر کردی گئی۔وہ اپنے ہتھیار اتار کر آرام کی نیند سوگئی۔دشمن نے موقع غنیمت سمجھ کر شبخون مارا۔اور ہتھیاروں پر قبضہ کر کے اسے قیامت تک کے لئے ابدی نیند سلا دیا۔

جب نصاریٰ نے اس کمین گاہ پر قبضہ کرلیا تو بہت سی توپیں اور منجنیقیں نزدیک ترین شہر پناہ اور قریب ترین برج پر ان کے گرانے اور محاذی پھاٹک کھولنے کے لئے لگادیں۔اور دن رات گولوں اور بندوقوں سے گولیوں کا مینھ برسانا شروع کردیا۔جس سے شہر پناہ کی دیوار اور برجوں میں شگاف پڑ گئے۔پھاٹک گر پڑا۔اور امیدوں کے رشتے ہاتھ سے چھوٹ گئے۔حائل

پردہ درمیان سے اٹھ گیا۔ کوئی لشکری اٹھنے بیٹھنے کی وہاں قدرت نہ رکھتا تھا۔ نہ دیوار پر چڑھ کر جھانک سکتا تھا۔ جو جھانکتا تھا گولی کا نشانہ بن کر خندق میں جا پڑتا تھا۔

اب نصاریٰ نے یہ چال چلی کہ ایک لشکر دوسرے دروازے کی طرف روانہ کیا۔ تاکہ دوسری طرف سے حملہ محسوس کیا جائے۔ یہ دیکھ کر مجاہدین، اور لشکریوں کا گروہ ادھر متوجہ ہوگیا۔ اور دشمن کا مکر نہ سمجھتے ہوئے وہاں مدافعت میں مشغول ہوگیا۔ یہ موقع پا کر نصاریٰ اور ان کا لشکر، اسی گرے ہوئے پھاٹک، ٹوٹی ہوئی دیوار اور منہدم برج سے داخلِ شہر ہوگئے۔ وہاں انھیں کوئی مزاحم و مدافع نہیں ملا۔

پس وہ تلاش کر کے ان لوگوں کے گھروں میں پہنچ گئے جو پہلے ہی سے ان کے معاون و مددگار بن چکے تھے۔ انھوں نے فوراً ان کی حفاظت کا گھروں میں انتظام کیا۔ اور جلد جلد پہلے سے تیار شدہ ضیافت سے نوازا۔ انھیں خوب پیٹ بھر کر گوشت اور دودھ کھلایا پلایا اور تمام ضرورت کی چیزیں مہیا کیں۔

مکانوں کے دروازے بند کر کے دیواروں میں روزن کر دیئے تا کہ جو "باغی" ادھر آ نکلے اس پر گولی چلا کر اپنی حفاظت کر سکیں۔ چنانچہ جو لشکری یا شہری ادھر آ نکلتا یہ بندوق چلا کر مار ڈالتے۔ اور مقابل کا ان پر کوئی قابو نہ چلتا تھا۔

وہ فرصت کے منتظر رہتے تھے کہ موقع پا کر اپنے دوستوں کے گھروں کی طرح دوسرے گھروں میں بھی پہونچ کر انھیں شب و روز کی آرام گاہ بنائیں لیکن وہ لعنتی جب بھی نکلتے پکڑ کر قتل کر دیئے جاتے۔ اس لئے جہاں انھیں مقابلہ کا اندیشہ ہوتا وہاں بہت کم نکلتے۔ اس کے باوجود انھیں پہاڑی سے مسلسل مدد پہنچ رہی تھی۔ اور ہر عیسائی دوست ہندو ان کی مدد میں پیش پیش تھا۔

بڑی مصیبت یہ آپڑی تھی کہ شہر میں نہ کوئی جائے پناہ رہی تھی اور نہ حاکم ہی رہا تھا۔ کیوں کہ حاکم (بہادر شاہ ظفر) اپنے اہل و عیال کو لے کر شہر سے تین میل دور مقبرہ (مقبرۂ ہمایوں۔ شاہد شیروانی) میں جا چکا تھا۔ وہ دراصل اپنی بیگم اور خائن وزیر کا مطیع تھا۔ جس نے کذب و بہتان سے کام لے کر دھوکے میں ڈال رکھا تھا۔ اس نے یہ کہہ کر بادشاہ کو پھسلایا تھا کہ نصاریٰ قابض ہونے کے بعد اس کے ساتھ اچھا سلوک کریں گے۔ اور اسی کو بزرگی و سرداری بخش دیں گے۔ وہ فریب خوردہ ان شیطانی وعدوں اور ابلیسی آرزوؤں پر خوش تھا۔

بادشاہ کے ساتھ اس کے تمام امراو متعلقین بھی اپنے اہل وعیال کو لے کر گھروں میں مال و متاع چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ان سب کے شہر چھوڑ کر چلے جانے سے شہریوں پر سراسیمگی اور رعب طاری ہو جانا قدرتی امر تھا۔ مرعوب ومتأثر لوگ بھی مکان چھوڑ بھاگے۔

جب شہر کے مکان مکینوں سے خالی ہو گئے تو نصاریٰ اور ان کا لشکر ان میں داخل ہو گیا۔ انھوں نے مال ومتاع لوٹا، باقیماندہ ضعیفوں، بچوں اور عورتوں کو قتل کرنا شروع کیا۔ بہادرانِ شہر میں سے ایک بھی ایسا نہ بچا تھا جو ان کا کسی اعتبار سے مقابلہ کر سکتا۔

''باغی'' لشکروں میں سے بعض تو نصاریٰ کے قبضہ سے پہلے ہی بھاگ گئے۔ بعض قبضہ کے بعد ثابت قدم نہ رہ سکے۔ بعض کئی بار شہر میں مصروف کارزار رہ کر بے دم ہو چکے تھے۔ اب بنیوں اور دوسرے ہندوؤں نے جو نصاریٰ کے دوست تھے اور بادشاہ کے ان کارپردازوں (مرزا الٰہی بخش وغیرہ۔ شاہد شیروانی) نے جو مجاہد گروہ کے دشمن تھے ایسی تدبیر سوچی جس سے شہریوں اور لشکریوں کو ہلاک کر سکیں۔ انھوں نے وہ سب غلہ جو بنیوں کے پاس تھا چھپا دیا اور دیہات و قصبات سے جو ان کے پاس اناج آتا رہتا تھا وہ روک دیا۔

یہ تدبیر کارگر ہوئی۔ لشکری اور شہری بھوک، پیاس، سوزش اور بے چینی سے دن رات گذارنے لگے۔ بالآخر مجبور و پریشان ہو کر بھاگ چھوٹے۔ پھر تو نصاریٰ نے شہر کے پھاٹک، شہر پناہ، قلعہ، بازار اور مکانوں پر مکمل قبضہ جما لیا۔

اس وقت دہلی میں میرے اکثر اہل وعیال (مولوی شمس الحق اور ان کی والدہ وغیرہ۔ شاہد شیروانی) موجود تھے۔ اور مجھے بلایا بھی گیا تھا۔ ساتھ ہی فلاح وکامیابی، کشائش وشادمانی کی امید بھی تھی۔ جو کچھ ہونے والا تھا وہ تو پہلے ہی مقدر ہو چکا تھا۔ میں نے دہلی کا رخ کر دیا وہاں پہنچ کر اہل وعیال سے ملا۔ اپنی عقل وفہم کے مطابق لوگوں کو اپنی رائے اور مشورہ سے آگاہ کیا لیکن نہ انھوں نے میرا مشورہ قبول کیا اور نہ میری بات مانی۔

جب نصاریٰ کا شہر پر اچھی طرح تسلط ہو گیا اور کوئی لشکری وشہری باقی نہ رہا۔ غلہ اور پانی دشمنوں کے ظلم واستبداد کی وجہ سے ناپید ہو گیا تو پانچ شبانہ روز اسی حالت میں گذار کر اپنی عزیز ترین متاع کتابیں، مال واسباب چھوڑ کر (بار برداری کا انتظام نہ ہو سکنے کی وجہ سے) خدا پر بھروسہ کر کے اہل وعیال کو ساتھ لے کر نکل کھڑا ہوا۔

شہر اور اس کے مال و دولت پر سفید رو لشکریوں کے ذریعہ قابض ہو کر نصاریٰ کی تمام تر توجہ، بادشاہ اور اس کے بیٹوں اور پوتوں کے پکڑنے کی طرف مبذول ہوئی۔

ان سب نے اپنا مستقر (مقبرہ) اب تک نہ چھوڑا تھا۔ تقدیر الٰہی نے وہیں برقرار رکھا تھا۔ انھیں اپنے جھوٹے اور مکار وزیر کی کذب بیانی پر اعتماد تھا۔ وہ اس مقبرہ میں بڑے خوش اور مگن تھے۔ مخدوم بنے ہوئے دن گذار رہے تھے۔

اس فریب خوردگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ حسرت کشیدہ، دل تپیدہ بیٹوں اور پوتوں کے ساتھ پابہ زنجیر شہر کی طرف لے جایا گیا۔ راستے میں، بیٹوں اور پوتوں کو کسی سردار (مسٹر ہڈسن نے مرزا مغل اور خضر سلطان وغیرہما کو گولی کا نشانہ بنایا تھا۔ شاہد شیروانی) نے بندوق کا نشانہ بنایا۔ دھڑ وہیں پھینک کر سروں کو خوان میں لگا کر بادشاہ کے سامنے تحفۂ پیش کیا۔ پھر ان سروں کو بھی کچل کر پھینک دیا۔

بادشاہ کو، گورے منھ، سیاہ دل، گندمی بال اور کنجی آنکھ والوں کی حراست میں سوئی کے سوراخ سے بھی تنگ کوٹھری میں مقید کر دیا۔ پھر اس وسیع ملک سے نکال کر دور دراز جزیرہ (رنگون) میں پہنچا دیا۔

بادشاہ کے ساتھ اس کی بیگم (ملکہ زینت محل) کو بھی روانہ کیا گیا جو نصاریٰ کی اس وقت بھی مطیع و دوست تھی۔ جب کہ وہ حقیقت میں ملکہ تھی وہ اپنی آرزوں، (بیٹے کو جانشیں بنانے) میں ناکام رہی۔ اس کا جمع کردہ مال بھی چھین لیا گیا وہ زینت (زینت محل) بننے کے بعد بدصورت اور حفاظت کے بعد بدہیئت بنی۔ بادشاہ کی قوم میں سے جو بھی ملتا اس کی گردن ماردی جاتی۔ یا پھانسی دی جاتی جیسا کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی عمل کیا گیا۔ ان کمزوروں میں سے وہی بچ سکا جو رات میں چھپ کر یا دن میں نظر بچا کر تیزی سے بھاگ گیا۔ اور ایسے خوش نصیب بہت کم تھے۔

پھر نصاریٰ نے شہر کے گرد و نواح کے رئیسوں اور سرداروں کو قتل کرنا، ان کی جائداد، عمارتیں، مویشی، مال و متاع، ہاتھی، گھوڑے، اونٹ اور ہتھیار وغیرہ کو لوٹنا شروع کیا۔ اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ ان کے اہل و عیال کو بھی قتل کر ڈالا۔ حالاں کہ سب رعایا بن چکے تھے۔ اور ڈر یا لالچ سے فرماں بردار بن ہی جاتے۔ انھوں نے تمام راستوں پر چوکیاں بٹھا دیں تاکہ بھاگنے والوں کو پکڑ پکڑ کر لایا جائے۔ ہزاروں بھاگنے والوں میں تھوڑے ہی بچ پائے باقی سب پکڑے گئے۔

ان لوگوں کے پاس جو کچھ چاندی سونا نکلتا پہلے تو وہ چھین لیتے۔ پھر چادر، تہبند، قمیص

پاجامہ جو کچھ ہاتھ لگتا نہ چھوڑتے۔اس کے بعد افسروں کے پاس پہنچا دیتے۔وہ ان کے لئے قتل یا پھانسی کی سزا کا فیصلہ کرتے۔جوان، بوڑھا، شریف اور رذیل سب کے ساتھ یہی سلوک ہوتا۔ اس طرح پھانسی پانے والوں اور قتل ہونے والوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی۔ظالموں کے ظلم کا شکار اکثر و بیشتر مسلمان تھے۔

ہندوؤں میں سے صرف وہ مارے گئے جن کے متعلق دشمن و معاند ہونے کا یقین تھا۔اور مسلمانوں میں سے فقط وہ بچ سکے جو کسی نہ کسی طرح وہاں سے ہجرت کر گئے تھے۔یا وہ جو نصاریٰ کے ناصر اور اپنے دین و مذہب میں قاصر تھے۔یا وہ جو ان کے جاسوس اور اللہ کی رحمت سے مایوس تھے۔انھیں میں سے بادشاہ کا وہ عامل (حکیم احسن اللہ خاں۔شیروانی) بھی تھا جس نے نصاریٰ کو مسلط کر کے حاکم بنایا تھا۔لیکن اسے امیدوں کی محرومی اور ناکامی کی حسرت کا غم اٹھانا پڑا۔اس کا حال متغیر ہوگیا۔زمانے میں ذلیل و خوار ہو کر جیا۔دنیا اور آخرت دونوں جگہ نقصان میں رہا۔اور یہی کھلا ہوا نقصان ہے۔

ادھر نصاریٰ نے ماتحت ہندو رؤسا کے پاس پیغام بھیجا کہ جو شخص بھی تمہارے علاقہ میں سے گذرے اسے پکڑ لیا جائے۔ان بداطواروں نے کافی تعداد میں مسافروں اور مہاجروں کو پکڑ کر نصرانی سرداروں کے پاس پہنچا دیا۔ان ظالموں نے سب کو مار ڈالا۔نہ کوئی عالی خاندان فرد بچ سکا نہ کسی ادنیٰ انسان کو چھٹکارا نصیب ہوا۔پھر اطراف و اکنافِ ملک میں لشکر بھیجے جنھوں نے قتل و غارتگری کی انتہا کر دی۔

اس ابتلاء عظیم میں پردہ نشیں خواتین پیدل نکل کھڑی ہوئیں۔ان میں بوڑھی اور عمر رسیدہ بھی تھیں۔جو تھک کر عاجز ہو گئیں۔بہت سی خوف کی وجہ سے جان دے بیٹھیں۔اور پچاسیوں عفت و عصمت کی بنا پر ڈوب کر مر گئیں۔اکثر پکڑ کر قیدی بنالی گئیں۔اور طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا ہو گئیں۔کچھ کو بعض رذیلوں نے لونڈیاں بنالیا۔اور بعض چند ٹکوں کے بالعوض بیچ ڈالی گئیں۔بہت سی بھوک، پیاس کی تاب نہ لا کر مر گئیں۔بہت سی ایسی غائب ہوئیں کہ پھر نہ تو لوٹ کر ہی آئیں نہ ان کا کچھ پتہ ہی چل سکا۔

ہزاروں عورتیں، اپنے سرپرستوں، شوہروں، باپوں، بیٹوں، اور بھائیوں سے جدا کر دی گئیں۔وہ ایسی مصیبت کا زمانہ تھا جو قیامت کا منظر پیش کر رہا تھا۔کہ اس دن انسان اپنے بھائی،

ماں باپ، بیوی، اولاد، اور اہل خاندان سے بھاگتا نظر آئے گا۔

بہت سی صبح کی سہاگن عورتیں شام کو بیوہ بن گئیں۔ اور شب کو آغوشِ پدر میں سونے والے بچے صبح کو یتیم ہو کر اٹھے۔ کتنی ہی عورتیں اپنی اولاد وغیرہ کے غم میں گریہ وزاری کرتی تھیں۔ اور کتنے مردوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا جاری تھا۔ شہر چٹیل میدان اور بے آب وگیاہ جنگل بن گیا تھا۔ اور شہری تباہ وبرباد ومنتشر ہو گئے تھے۔

اس کے بعد نصاریٰ کی توجہ مشرقی شہروں اور دیہات کی طرف مبذول ہوئی۔ وہاں بھی بڑا فساد مچایا۔ قتل وغارتگری اور پھانسی کا بازار گرم کر دیا۔ بے شمار مرد اور پردہ نشیں مستورات موت کے گھاٹ اتر گئے۔ اور سینکڑوں، ہزاروں رعایا کے آدمی مار ڈالے گئے۔

میرا کیا پوچھنا، میں اپنے وطنِ مالوف (خیر آباد، اودھ) کی طرف چلا جا رہا تھا۔ راستہ خوفناک اور رہ گذار اندوہناک تھا۔ میرے اور وطن کے درمیان کئی خوف وخطرہ سے بھری ہوئی منزلیں تھیں۔ نصاریٰ اور ان کا لشکر، دن رات تلاش وتجسس میں سرگرداں رہتا۔ جاٹوں کو مسافروں کے مار ڈالنے، لوٹنے، ڈاکہ ڈالنے کی کھلی چھٹی دے دی گئی تھی۔

انھوں نے سارے ناکے بند کر رکھے تھے۔ اور کسی گھاٹ پر کوئی کشتی یا ناؤ تک نہ چھوڑی تھی۔ کشتیوں کو پھاڑ ڈالتے بلکہ خراب کر کے غرق کر دیتے یا جلا ڈالتے۔

ملاحوں کو روک دیا تھا تاکہ کوئی سیاح یا مسافر کسی وقت بھی ادھر سے نہ گذر سکے۔

خدائے مالک الملک نے مجھے اور میرے متعلقین کو ہر مصیبت وہلاکت سے محفوظ رکھ کر، پل اور کشتی کی مدد کے بغیر، دریاؤں اور نہروں کو عبور کرا کے نجات دی۔ اور ہم سب کو آفاتِ مسافات، مہالکِ مسالک، حوادثِ راہ، اور مصائبِ گذرگاہ سے مصؤن ومامون رکھا اور اپنی پوری حفاظت، کامل حمایت، مکمل نعمت اور بے شمار رحمت کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے جوار ودیار اور احباب ورشتہ دار تک پہنچایا۔ ہم خدا کی اس بے پناہ عنایت اور تمام آفات سے حفاظت پر اس کا شکر بجالائے۔

نصاریٰ کے "باغی" گروہوں اور ہمارے نواح کے متعدد لشکروں نے اپنے سابق معزول والی (واجد علی شاہ اختر۔ شاہد شیروانی) کی ایک بیگم (حضرت محل۔ شاہد شیروانی) اور اس کے ایک ناتجربہ کار اور ناسمجھ لڑکے (برجیس قدر۔ شاہد شیروانی) کو امیر وحاکم بنا ڈالا۔ نصاریٰ نے اس والی سے اس کا ملک چھین لیا تھا۔ وہ بڑا واہی ولاہی تھا۔ عیش وطرب میں منہمک، انتظامِ ملکی سے

غافل، عقل وخرد سے بیگانہ اور نقضِ عہد ومیثاق میں یگانہ تھا۔ نصاریٰ کی عملداری ختم ہونے پر وہ ملکہ، مالکہ بن گئی۔ اس کالڑکا چھوٹا، ناتجربہ کار، ناز پروردہ، ہمسنوں کے ساتھ کھیلنے والا اور دشمن سے لاپرواہ تھا۔ تدبیرِ امور مملکت، اِجرائے احکام اور قیادتِ فوج کی صلاحیت نہ رکھتا تھا۔ اس کے اَعیانِ سلطنت وارکانِ دولت (ممّوخاں وغیرہ۔ شاہد شیروانی) سب کے سب نااہل، سست، بزدل، احمق، خائن اور غیر دیانتدار تھے۔ اکثر ذلیل اور بعض بندگانِ زر تھے۔ ان میں سفیہہ، عیش پرست، نادان، بلند آواز، سُست، منافق، چرب زبان، ذلیل، غلام زادہ، حیران وپریشان، ظالم وجابر، حیلہ ساز ومتکبر، خائن ومکار، بندۂ زر وغیبت خور سبھی قسم کے لوگ تھے۔

بعض ایسے بھگوڑے مدبر تھے کہ ان کی تدبیر، تباہی وبربادی واِدبار کی طرف لے جاتی تھی۔ اور صاحب نظر افراد کو عبرت کے عجیب عجیب مناظر دکھاتی تھی۔ ان میں سے اکثر نصاریٰ کے معاون ومددگار اور محبّ وفاشعار تھے۔ اور یہ سب کے سب دشمن کی ہلاکت خیز تدبیروں سے ناواقف اور ان کی مصلحت اندیشی سے بے خبر تھے۔

نصاریٰ اپنے بچوں اور عورتوں کے ساتھ شہر (لکھنؤ) میں محصور مگر مخالف گروہ کی ناقص تدبیروں کی وجہ سے اپنے مکانوں (بیلی گارد) میں محفوظ تھے۔ نصاریٰ نے خندقیں کھود کر اور حصار بنا کر ان مکانوں کو قلعہ کی شکل دے لی تھی۔ مقابل لشکر، ان پر حملہ آور ہو کر پسپا ہو جاتا تھا۔ جو کچھ کہتا وہ نہ کر پاتا تھا۔ اسی حالت میں محصورین کی امداد کے لئے سفید رُو گروہ آگیا۔ شہر میں داخل ہونے لگا۔ تو بہادر غازیوں نے ڈٹ کر مقاتلہ کیا۔ بہت سے گورے مارے گئے۔ باقی ماندہ دل شکستہ اور حسرت زدہ ہو کر محصورین تک پہنچ گئے۔ پھر تازہ دم ہو کر یہ مکانوں سے نکلے تو بزدلی اور کوتاہی کی وجہ سے کوئی مقابلہ پر نہ آیا۔ نصاریٰ نے شہر سے دو میل دور باغ پر قبضہ جما لیا۔ اور قوت وبہادری سے اسی کو اپنا گڑھ بنا لیا۔ وہاں مدد پر مدد اور سامان پر سامان جمع کر لیا۔

وہ لشکری جو شہر میں پہلے سے موجود تھے اور وہ جو دہلی (جنرل بخت خاں وشہزادہ فیروز شاہ وغیرہما۔ شاہد شیروانی) سے بھاگ کر بیگم کی پناہ میں آگئے تھے۔ جن کو ملکہ نے قدر ومنزلت کے ساتھ جود وبخشش سے نوازا تھا۔ اور تنخواہ دار سپاہیوں کا وہ جم غفیر، جو حرب وضرب سے نابلد، اسلحہ بندی سے ناواقف، اور مصلحت ومعرکہ سے ناآشنا تھا۔ یہ سب اس باغ پر خندقیں کھود کر اور کمین گاہ بنا کر جاڈٹے۔

دونوں فریقوں میں ایک مدت تک مقابلہ ومقاتلہ اور نیزہ بازی وتیر اندازی ہوتی رہی۔ تنگ آکر نصاریٰ نے پہاڑوں کے والی سے مدد مانگی۔اس نے ان کی آرزو کے مطابق تیس ہزار سے زیادہ پہاڑی لشکر بھیج کر مدد کی۔

اب تو نصاریٰ، ان کی گوری فوجوں، کرایہ کے سپاہیوں، اور لالچی معاونوں نے ایک ساتھ حملہ کر دیا۔ یہ حملے بڑے سخت، متواتر اور مسلسل تھے۔ جنھوں نے مقاتلین کو ان کی جگہ سے ہلا دیا۔ اور ان کے پاؤں اکھاڑ دیئے۔ وہ کمین گاہوں سے ایسی بری طرح بھاگے کہ شہر کی سرحدوں پر بھی نہ ٹھیر سکے۔

ملکہ اور اس کے لڑکے کو تنہا محل میں چھوڑ بھاگے۔ان دونوں سے وقت پر بہت سے ارکان دولت واعیانِ سلطنت نے دغا کی۔اور وہ دیہاتی جوان کے علاقہ سے ان کی مدد واعانت، عزت وآبرو، مال ودولت کی صیانت وحفاظت کے لئے آئے تھے عہد شکنی کر کے اور کفر کو ایمان سے بدل کر منافق بن گئے۔نصاریٰ کی موافقت ورفاقت کرنے لگے۔نصاریٰ مع معاونین شہر میں داخل ہو گئے۔شہر کے رہنے والے گھروں کو خالی کر کے نکل گئے۔

نصاریٰ اور ان کی گوری فوج اور مددگاروں نے اس شاہی محل کا جس میں ملکہ تھی محاصرہ کر لیا۔ بیگم اپنے ولی عہد اور دو سہیلیوں کو لے کر محصور محل کی پشت سے نکل کر دوسرے محلہ میں تیزی سے پیدل پہونچ گئی۔ تین دن شہر میں رہ کر بھاگے ہوئے لشکر کو واپس کرنے اور اس سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ وہ لشکر ایسا دہشت زدہ ہو چکا تھا کہ کسی صورت سے اس نازک موقع پر دستگیری کو تیار نہ ہوا۔ نہ ان میں سے کوئی متنفس لوٹا اور نہ شہر بھر میں کہیں جائے پناہ ہی رہی۔

آخر کار بیگم اپنے اعوان وانصار سے مایوس ہو کر ولی عہد اور چند ساتھیوں کو ساتھ لے کر، چٹیل میدان اور بے آب وگیاہ جنگل کی طرف چل کھڑی ہوئی۔ اب اس کے گرد، کمزور دل سواروں کی کچھ جماعتیں، پیدل مردوں کا انبوہ کثیر، شہریوں اور عزت دار عورتوں کی کافی تعداد آکر جمع ہوگئی۔ وہ شہری ننگے بدن اور ننگے پاؤں تھے حالاں کہ سرداروں میں سے تھے اور عورتیں ننگے پاؤں اور بے پردہ تھیں حالاں کہ گرامی قدر، پردہ نشیں اور محل سراؤں کی رہنے والی تھیں۔ وہ سرسبز وشاداب خطوں سے چٹیل میدان کی طرف پھینک دی گئیں۔ وہ پیوندوں کے کپڑے پہن کر ستر پوشی کرتی تھیں اور برقعے نہ ہونے سے اس پر اکتفا کرتیں۔ ایک میدان سے دوسرے میدان

میں پہنچتیں، بے پردگی میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا۔ وہ عیش وعشرت میں زندگی بسر کرتی تھیں پھر دور دراز جنگل اور پر خطر میدان میں ڈال دی گئیں۔ ان لوگوں کو محلات، پائیگا ہیں اور ریاستیں چھوڑنی پڑیں، حالاں کہ وہ ان سے ذرا بھی ہٹنا نہ چاہتے تھے۔ یہاں تک کہ حال متغیر، وبال نازل اور ہلاکت عام ہوگئی۔

یہ ایسی مہلک مصیبت نازل ہوئی جس نے شہروں کو میدان، آزادوں کو غلام، مالداروں کو فقیر ومسکین اور شریفوں کو خوار وذلیل بنا دیا۔ وہ اپنے اہل وعیال میں آرام وآسائش کی زندگی بسر کررہے تھے۔ خوش حال، اور فارغ البال تھے کہ مجبور ہو کر نکلنا پڑا۔ فقیری وتنگدستی نے ہمسنوں کی مجالست اور اضطراب واضطرار نے برابر والوں کی رفاقت سے دور کر دیا۔ رونے والے آہ وزاری، بیمار فریاد و شیون کرتے، آرزو مند چلاتے، اور حسرت کشیدہ انا للہ پڑھتے۔ بچے اپنی ماؤں کے سینوں سے قبل از وقت جدا کر دیئے گئے تھے۔ بوڑھے اور جوان حاجتوں کے پورا کرنے سے ناامید تھے۔ نہ ان کا کوئی ٹھکانہ تھا نہ بیماری کی دوا تھی۔ ان کے دل خالی تھے۔ ان میں نہ کوئی خواہش تھی نہ انھیں کوئی بات بھاتی تھی۔ زندگی اور موت ان کے لئے دونوں برابر تھے۔

وہ مسرت وشادمانی، تخت شاہی، دیباج وحریر، میوے، خوش طبعی، عیش وعشرت، نظافت و نزاہت، نزاکت ونعمت، نغمہ وسرود، مال ودولت، خیر سگالی ومروّت میں پلے تھے۔ آج ان کی راہ میں کانٹے ہیں۔ سامان وزادِ راہ کا پتہ نہیں۔ کپڑے بوسیدہ ہیں اور عیش وراحت میں کوئی حصہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے انہیں معاف کرے اور ظالموں کو سخت گرفت میں لے۔

پھر والیہ یعنی حضرت عالیہ اس لشکر کو جو بھاگ کر اس کی پناہ میں آگیا تھا اور دوسرے ساتھیوں کو لے کر ایسے دریاؤں اور نہروں سے گذری جن سے بغیر کشتی کے عبور مشکل و دشوار تھا۔ وہ شمالی ملک میں دریا کے کنارے ایک گاؤں میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ اقامت گزیں ہوگئی۔ اور دریا کے گھاٹوں پر سوار، پیادے بٹھا دیئے کہ تمام کشتیوں پر قبضہ کرلیں۔ اور دشمنوں کو دریا عبور نہ کرنے دیں۔

اس نے انتظام رعایا اور حصول خراج کے لئے شہروں اور قصبات ودیہات میں عامل بھیج دیئے۔ لشکروں کو آراستہ کر کے اپنے اس دار السلطنت کے قریبی مورچوں پر جس پر اب نصاریٰ کا قبضہ ہو چکا تھا بھیج دیا تا کہ اگر دشمن ادھر کا قصد کرے تو اس سے ڈٹ کر مقابلہ ومقاتلہ، مزاحمت و

مجادلہ کیا جائے۔لیکن یہ تمام امور مہمہ اوران کا اہتمام وانصرام ایسے ذلیل، غافل اور متحیر عامل (نواب احمد علی عرف موخاں۔شاہد شیروانی) کوسونپا گیا تھا جو کسی طرح اس کا اہل نہ تھا۔وہ صحیح مشورے سے گریزاں اور جہل سے ہم کنار تھا۔آسان بات کو سخت اور دشوار کو آسان سمجھتا۔وہ ذلیل، احمق اور بزدل تھا۔اس نے مکالمت ومشاورت، مجالست اور منادمت کے لئے احمق، جاہل، اور ذلیل طبقہ کو چن رکھا تھا۔وہ نخوت وغرور کی بناپر شریف سرداروں اور عقلمند رہنماؤں سے بچتا اور اپنے ہی اہل خاندان اور اعزہ میں سے جاہلوں اور احمقوں کو مصاحب وحاکم بناتا۔

چنانچہ اس ناتجربہ کار نے ان لشکروں پر کمین، ذلیل، بزدل اور رذیل لوگوں کو سردار بنادیا۔ وہ بڑے ہی لالچی تھے۔ جو کچھ لشکریوں کو خوراک وغیرہ دی جاتی کھاجاتے۔ وہ بددیانت تھے۔اپنی کینہ پروری کی وجہ سے ان کے غلہ اور جنس میں خیانت کرتے اور گراں فروشی کے مرتکب ہوتے۔ ہر آواز کو دشمن کی آواز سمجھتے۔ ہمیشہ اضطراب کے ساتھ خوف کی وجہ سے لرزتے رہتے۔کسی وقت بھی ان کو راحت وسکون میسر نہ تھا۔بزدلی سے ہر آواز کو موت کا پیش خیمہ اور ہر صدا کو موت کی پکار سمجھتے تھے۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کمینے دشمنوں کے سامنے محبت وحاجت کے ساتھ پیش ہورہے ہیں۔

نصاریٰ دارالسلطنت پر قبضہ کرنے کے بعد وہیں ڈٹے رہے۔اطراف وجوانب کی طرف نہ نکلے۔انھوں نے گرد ونواح کے کافروں، دیہاتیوں اور کاشتکاروں کی تالیفِ قلب شروع کردی۔ان کی خطاؤں کو درگزر،ان کے خراج میں تخفیف اور تاوانوں میں کمی کی۔

اس مہربانی پر وہ مطیع وفرماں بردار ومعاون ومددگار بن گئے۔ادھر سے مطمئن ہوکر اطرافِ ملک میں شہر ودیہات پر قبضہ کرنے کے لئے نصاریٰ نکل کھڑے ہوئے۔جب نصاریٰ اس مرصد (نواب گنج ضلع بارہ بنکی۔شاہد شیروانی) کی طرف متوجہ ہوئے جو دارالسلطنت سے جانب شمال آٹھ میل کے فاصلے پر واقع تھا۔اور جس میں سوار، پیادے اور وہ رذیل وذلیل قائد عظیم بھی تھا۔تو وہ کمین قائدان کی آمد کی خبر سن کر ہی اپنے ذلیل سرداروں کے ساتھ بھاگ گیا۔ بہادر ہندوؤں کی تھوڑی سی تعداد اپنے گاؤں کے بہادر رکھیا کے ساتھ مقابلہ پر ڈٹ گئی۔یہ سو سے زیادہ نہ تھے۔دشمنوں کو فنا کے گھاٹ اتار کر خود بھی کٹ گئے۔وہ فرار کی عار برداشت نہیں کرسکتے تھے اور بھگوڑے قائد کی طرف سے کافی لشکر اور ساز وسامان کے ہوتے ہوئے بھی

انھیں کوئی مدد نہیں پہنچ سکی تھی۔

نصاریٰ نے جب اس گاؤں کو جس میں وہ نامرد خائن عامل نگہداشت کے لئے موجود تھا، خالی اور ویران پایا تو اس پر قبضہ جما کر اپنا مضبوط و محفوظ قلعہ بنالیا۔ وہیں فوج جمع کرلی اور مدت تک وہیں مقیم رہے۔ وہ ایک میل بھی نکل کر نہ گئے۔ وہ سرداران لشکر کی امیدوں کی تکمیل، اور ان خائنوں کے ایفائے عہود کے منتظر تھے۔ اسی لئے اپنے ایفائے وعدہ میں بھی تاخیر کررہے تھے۔

ادھر سے فارغ ہوکر انھوں نے اس مغربی گوشے کا رخ کیا جہاں کے تمام باشندے ان کے مطیع ہوچکے تھے۔ اور دشمنوں پر ان کے معاون تھے۔ وہاں بھی ملکہ کی طرف سے ناعاقبت اندیش، غیر مدبر، ناتجربہ کار، اور ذلیل عامل تھا۔ وہ بھی پیٹھ پھیر کر مقابلہ کیے بغیر بری طرح بھاگا۔ سرنگ میں ہوکر اپنا راستہ بنایا۔ اس کے پاس سوار اور پیادے بھی کم تھے۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ کفار اور دیہاتیوں نے معاہدہ وقسم کے باوجود وقت پر دغا کی۔ غدر ومکر کی انتہا کردی۔

ناز ونعمت اور پُرعیش ومسرت زندگی کا کفران کیا۔ معاہدوں سے انکار کرکے کفر میں اضافہ اور ارتداد میں زیادتی کرلی۔ اس موقع پر متسلط نصاریٰ سے قتال کے لئے دوسری طرف کا ایک عامل (شاہ احمد اللہ مدراسی۔ شاہد شیروانی) اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے خیرات ومبرّات اور سعادات و حسنات کا کافی ذخیرہ اپنے اندر جمع کرلیا تھا۔ وہ بڑا ہی پاک طینت، صاف باطن، متقی، پرہیزگار، بہادر اور رسولِ ملاحم اور نبیِ مراحم ﷺ کا ہم نام تھا۔ اس نے نصاریٰ کے لشکر پر حملہ کرکے پہلے ہی حملہ میں شکست دے دی۔

اپنی ساری کوششیں ختم کرکے وہ بھاگے اور قصبہ کے ایک ہندو کے مضبوط ومحفوظ مکان میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ اور عظمائے نصاریٰ کے پاس شہر میں پیغام بھیج کر مدد مانگی۔ انھوں نے ایک لشکر اور منافقین ودہاقین کا جم غفیر جنھوں نے عہد شکنی کی تھی، ان محصورین کی مدد کو بھیج دیا۔

ادھر اس نیک سرشت بہادر عامل سے ایک دیہاتی کافر زمیندار (بلدیو سنگھ راجہ پوائیں ضلع شاہجہاں پور۔ شاہد شیروانی) نے بڑا داؤ کھیلا۔ اس نے قسمیں کھا کر اطمینان دلایا کہ جب دونوں جماعتیں مقابلہ پر آجائیں گی تو چار ہزار بہادروں کا گروہ لے کر مدد کو پہنچوں گا۔ جب مقابلہ کی نوبت آئی تو اس زمین دار کی قسموں پر بھروسہ کرکے اس دیانتدار عامل نے اپنے تھوڑے سے بہادروں کے ساتھ دشمن پر حملہ کردیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سامنے سے بندوقوں اور توپوں سے چھروں اور

سینوں پر نصاریٰ نے گولیاں برسائیں۔ اور پیچھے سے اس غدّار مکار زمین دار کی جماعت نے پشت وسرُین کونشانہ بنانا شروع کیا۔

وہ دراصل نصاریٰ کے انصار واعوان اور شیاطین کے اَتباع و اِخوان تھے۔ وہ خداپرست عامل معرکہ میں گرکر شہید ہوا۔ اوراس کی ساری جماعت نے بھی اسی کے نقش قدم پر چل کر جامِ شہادت نوش کیا۔ ان سب ابرار واخیار کی شہادت کے بعد بزدل لوگ ایسے بھاگے کہ نامردی اور اضطرار سے پیچھے مڑکر بھی نہ دیکھا۔ نصاریٰ نے تعاقب کر کے ان سب کو پکڑ کر قتل کرڈالا۔ تھوڑے سے وہ بچ رہے۔ جنھوں نے بھاگنے میں پوری تیزی اور عجلت سے کام لیا۔

اس نواح کے سارے باشندے، دہقانی، کاشتکار، مکھیا اور مقدم وغیرہم سب مطیع وفرماں بردار بن گئے۔ البتہ دو بہادر، غیرت منداور صف شکن جوانمردوں نے خوب جم کر مقابلہ کیا۔ اپنی بے پناہ شجاعت و بسالت سے قلتِ اسباب و جماعت کے باوجود دشمن کے ہزاروں سوار، پیادے ٹھکانے لگادیئے۔ آخر کار مجبور ہوکر اپنی بہادری سے جان بچاکر نکل گئے اور دشمن ان کا تعاقب نہ کرسکا۔ اب وہ نواح بھی صاف ہوگیا۔ ان دونوں سرداروں کی شکست کے بعد مخالفوں کے دل میں دشمن کا رعب قائم ہوگیا۔ یہ واقعہ رنج دِہ واقعات میں سے سب سے اہم اور آخری واقعہ اوراس جنگ کا خاتمہ تھا۔

نصاریٰ یہاں غالب ہونے کے بعد دوسرے اطراف میں پھیلنا شروع ہوئے۔ وہ جب کسی طرف کا قصد کرتے تو وہاں کے رہنے والے غم وفکر میں مبتلا ہوجاتے۔ اورلڑے بھڑے بغیر شکست مان لیتے۔ ان تمام فتح مندیوں کے بعد بھی ملکۂ نصاریٰ (وکٹوریہ) مکر سے باز نہ رہی۔ اس مکر کی وجہ سے انھیں بڑی قوت وطاقت حاصل ہوگئی۔ اس نے تمام دیہات، شہروں اور قصبوں میں مطبوعہ حکم نامے جاری کیے۔ جن میں عام معافی کا اعلان کیا۔ کہ تمام ''باغی'' لشکر اور سرکش و نافرمان رعایا کوان لوگوں کوچھوڑ کر معاف کیا جاتا ہے جنھوں نے عورتوں، بچوں اوران نصاریٰ کو جنھوں نے مجبور ہوکر پناہ لی تھی، ظلم وعداوت سے قتل کرڈالا۔ یاوہ جنھوں نے مجبور ہوکر پناہ لی تھی، ظلم وعداوت سے قتل کرڈالا۔ یاوہ جنھوں نے سلطنت وریاست قائم کی۔ یاوہ جنھوں نے سرکشی و عدوان پرلوگوں کوابھارا۔ ادھر وہ ''باغی'' لشکراور دوسرے بیگم کے ساتھی، روزی کے نہ ہونے اور تنخواہ وضروریاتِ زندگی میسر نہ آنے سے پریشان ہوچکے تھے۔

نصاریٰ کے مسلط و منتشر ہو جانے کی وجہ سے بیگم کے پاس خراج اور محاصل کا آنا بند ہو گیا تھا۔ زمین کشادگی کے باوجود ان پر تنگ ہو چکی تھی۔ وہ بڑی سخت مصیبت و تنگی میں پڑ گئے تھے۔ وہ سب تنگ دست اور عیش و راحت سے دور تھے۔ ان کے دل اہل و عیال کی جدائی سے پارہ پارہ تھے۔

ایسے حالات میں مجبور و مضطر ہو کر بہت سے لشکری وغیرہ نصاریٰ کے اطاعت گذار بن گئے۔ ان کے پاس ہتھیار، گھوڑے جو کچھ تھا چھین لیا گیا۔ اور پروانۂ امان دے دیا گیا۔ اب وہ اہل وطن کی طرف خائب و خاسر ہو کر لوٹے۔ پھر نصاریٰ سارے ملک پر بلا مزاحمت قابض ہو گئے۔ میدان کارزار اور لڑائیوں سے نجات پا گئے۔ بیگم اس تباہی و بربادی کے بعد بچے کچھے تھوڑے سے ساتھیوں کے ساتھ پہاڑوں (سرحدِ نیپال۔ شاہد شیروانی) کی چوٹیوں پر چلی گئی۔

میں مسافرت و غربت، اضطراب و مصیبت کی زندگی گذار رہا تھا۔ اور میرا اشتیاق و رغبت اپنے گھر، اہل و عیال، پڑوسی اور حباب تک پہنچنے کے لئے بڑھ رہا تھا کہ امن و امان کا وہی پروانہ جسے قسموں سے مؤکد کیا گیا تھا، نظر پڑا۔ اس پر بھروسہ کر کے اپنے اہل و وطن میں پہنچ گیا۔ مجھے اس کا بالکل خیال نہ رہا کہ بے ایمان کے عہد و پیمان پر بھروسہ اور بے دین کے قسم و یمین پر اعتماد کسی حالت میں درست نہیں۔ خصوصاً جب کہ وہ بے دین جزا و سزائے آخرت کا قائل بھی نہ ہو۔

تھوڑے دن کے بعد ایک حاکم نصرانی نے مجھے مکان سے بلا کر قید کر دیا۔ اور رنج و غم میں مبتلا و مقید کر کے دارالسلطنت (لکھنؤ) جو دراصل اب خانۂ ہلاکت تھا بھیج دیا۔ میرا معاملہ ایسے ظالم حاکم کے سپرد کر دیا جو مظلوم پر رحم کرنا ہی نہ جانتا تھا اور میری چغلی ایسے دو مرتد، جھگڑالو، تند خو افراد نے کھائی جو مجھ سے قرآن کی محکم آیت میں مجادلہ کرتے تھے۔ جس کا حکم یہ تھا کہ نصاریٰ کا دوست بھی نصرانی ہے۔ وہ دونوں نصاریٰ کی مؤدت و محبت پر مصر تھے۔ انھوں نے مرتد ہو کر کفر کو ایمان سے بدل لیا تھا۔

اس ظالم حاکم نے میری جلاوطنی اور عمر قید کا فیصلہ صادر کر دیا۔ اور میری کتابیں، جائداد، مال و متاع اور اہل و عیال کے رہنے کا مکان، غرض ہر چیز پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ اس شرمناک رویہ کا تنہا میں ہی شکار نہ بنا تھا۔ بلکہ بہت سی مخلوق سے اس سے بڑھ چڑھ کر ناروا سلوک روا رکھا گیا۔

انھوں نے عہد و پیمان توڑ کر ہزاروں مخلوقِ خدا کو پھانسی، قتل، جلاوطنی، قید اور حبس میں بلا تاخیر مبتلا کر دیا۔ وعدہ خلافی کر کے بیشمار نفسوں اور لاتعداد نفیس چیزوں کو تباہ کر ڈالا۔

اس طرح خونِ ناحق شمار سے آگے بڑھ گیا۔ سینکڑوں اور ہزاروں سے گنتی نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح شریف وغیر شریف قیدیوں کی تعداد حد سے متجاوز ہے۔ خصوصاً دہلی اور ہمارے دیار (اودھ) کے مابین وسیع علاقے میں جہاں شریف وعظیم خاندانوں کے شہر کے شہر، گاؤں کے گاؤں اور قصبے کے قصبے آباد ہیں۔

ان شرفا وعظماء کے پاس ایک رئیس نے جو اسلام وایمان کا مدعی بھی تھا۔ دارالریاست میں طلبی کے ساتھ امن وامان کا پیغام بھیجا۔ وہاں پہنچنے پر اپنے وعدے سے پھر کر نصاریٰ کی خوشنودی کی خاطر غداری کر کے ان سب کو گرفتار کر لیا۔ بدعہدی کہ سارے مذاہب میں مذموم وممنوع ہے اس کا بھی لحاظ نہ کیا۔ یہ بدبخت نصاریٰ کی رضا جوئی میں خدائے عزیز ومنتقم کے غضب سے بھی نہ ڈرا۔ نصاریٰ نے ان سب کو ہتھکڑی اور بیڑی پہنا کر محبوس کر دیا۔ اکثر شرفا کو قتل اور باقی کو قید، جلاوطنی، اور طرح طرح کے عذاب میں مبتلا کیا۔ اس طرح وہ بدنصیب رئیس بھی نصاریٰ کے ساتھ اللہ کی مخلوق کو سخت عذاب میں مبتلا کرنے کی وجہ سے اجر وانعام کا مستحق بن گیا۔

یہ المناک کہانی یوں ختم ہوئی۔ اب میرا ماجرا سنیئے:

مکر وتلبیس سے نصاریٰ نے جب مجھے قید کر لیا تو ایک قید خانے سے دوسرے قید خانے، اور ایک سخت زمین سے دوسری سخت زمین میں منتقل کرنا شروع کیا۔ مصیبت پر مصیبت اور غم پر غم پہونچایا۔ میرا جوتا اور لباس تک اتار کر موٹے اور سخت کپڑے پہنا دیئے۔ نرم وبہتر بستر چھین کر، خراب، سخت اور تکلیف دہ بچھونا حوالہ کر دیا۔ گویا اس پر کانٹے بچھا دیئے گئے تھے یا دہکتی ہوئی چنگاریاں ڈال دی گئی تھیں۔ میرے پاس لوٹا، پیالہ اور کوئی برتن تک نہ چھوڑا۔ بجل سے ماش کی دال کھلائی اور گرم پانی پلایا۔ محبانِ مخلص کے آبِ محبت کے بجائے گرم پانی اور ناتوانی وکبرسنی کے باوجود ذلت ورسوائی سے ہر وقت سامنا رہا۔

پھر ترش رو دشمن کے ظلم نے مجھے دریائے شور (جزیرۂ انڈمان) کے کنارے ایک بلند و مضبوط، ناموافق آب وہوا والے پہاڑ پر پہنچا دیا۔ جہاں سورج ہمیشہ سر پر ہی رہتا تھا۔ اس میں دشوار گذار گھاٹیاں اور راہیں تھیں جنھیں دریائے شور کی موجیں ڈھانپ لیتی تھیں۔ اس کی نسیم صبح بھی گرم وتیز ہوا سے زیادہ سخت اور اس کی نعمت زہر ہلاہل سے زیادہ مضر تھی۔ اس کی غذا حنظل سے زیادہ کڑوی، اس کا پانی سانپوں کے زہر سے بڑھ کر ضرر رساں، اس کا آسمان غموں کی بارش کرنے والا، اس کا بادل رنج وغم برسانے والا، اس کی زمین آبلہ دار، اس کے سنگریزے بدن کی

پھنسیاں اوراس کی ہوا ذلت وخواری کی وجہ سے ٹیڑھی چلنے والی تھی ۔ ہر کوٹھری پر چھپر تھا جس میں رنج ومرض بھرا ہوا تھا۔ میری آنکھوں کی طرح ان کی چھتیں ٹپکتی رہتی تھیں ۔ ہوا بدبودار اور بیماریوں کا مخزن تھی ۔ مرض سستا اور دوا گراں ، بیماریاں بے شمار ، خارش وقوباء (وہ مرض جس سے بدن کی کھال پھٹنے اور چھلنے لگتی ہے) عام تھی ۔ بیمار کے علاج ، تندرست کے بقاے صحت اور زخم کے اندمال کی کوئی صورت نہ تھی ۔ معالج ، مرض میں اضافہ کرنے والا ، معالج ، ہلاک کرنے والا ۔ طبیب ، تکلیف ورنج بڑھانے والا تھا۔ رنجیدہ ومریض کی نہ غم خواری ہی کی جاتی نہ اس پر رنج و افسوس کا ہی اظہار ہوتا۔

دنیا کی کوئی مصیبت یہاں کی المناک مصیبتوں پر قیاس نہیں کی جاسکتی ۔ یہاں کی معمولی بیماری بھی خطرناک ہے ۔ بخار موت کا پیغام ، مرض سرسام اور برسام (دماغ کے پردوں کا ورم) ہلاکت کی علت تام ہے ۔ بہت مرض ایسے ہیں جن کا کتب طب میں نام ونشان نہیں ۔ نصرانی ماہر طبیب ، مریضوں کی آنتوں کو تنور کی طرح جلاتا اور مریض کی حفاظت نہ کرتے ہوئے آگ کا قبہ اس کے اوپر بناتا ہے ۔ مرض نہ پہچانتے ہوئے دوا پلا کر موت کے منھ کے قریب پہونچا دیتا ہے ۔ جب کوئی ان میں سے مرجاتا ہے تو نجس وناپاک خاک روب جو درحقیقت شیطانِ خناس ، دیو ہوتا ہے اس کی ٹانگ پکڑ کر کھینچتا ہوا غسل وکفن کے بغیر اس کے کپڑے اتار کر ریگ کے تودے میں دبا دیتا ہے ۔ نہ اس کی قبر کھودی جاتی ہے نہ نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے ۔

یہ کیسی عبرتناک والم انگیز کہانی ہے ۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر میت کے ساتھ یہ برتاؤ نہ ہوتا تو اس جزیرہ میں مرجانا سب سے بڑی آرزو ہوتی ۔ اور اچانک موت سب زیادہ تسلی بخش تھی ۔ اور اگر مسلمان کی خودکشی مذہب میں ممنوع اور قیامت کے دن عذاب وعقاب کا باعث نہ ہوتی تو کوئی بھی یہاں مقید ومجبور بنا کر تکلیف مالایطاق نہ دیا جاسکتا ۔ اور مصیبت سے نجات پالینا بڑا آسان ہوتا۔

یہ ناقابل برداشت حالات تھے ہی کہ میں متعدد سخت امراض میں مبتلا ہوگیا۔ جس کی وجہ سے میرا صبر مغلوب ، میرا سینہ تنگ ، میرا چاند دھندلا ، اور میری عزت ذلت سے بدل گئی ۔ میں نہیں جانتا کہ اس دشوار وسخت رنج وغم سے کیوں کر چھٹکارا ہوسکے گا ۔ خارش وقوباء میں ابتلا اس پر مستزاد ہے ۔ صبح وشام اس طرح بسر ہوتی ہے کہ تمام بدن زخموں سے چھلنی بن چکا ہے ۔ روح کو تحلیل کردینے والے درد وتکلیف کے ساتھ زخموں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے ۔ وہ وقت دور نہیں

جب یہ پھنسیاں مجھے ہلاکت کے قریب پہنچادیں۔

ایک زمانہ وہ بھی تھا جب عیش و مسرت، راحت و عافیت میں زندگی بسر ہوتی تھی۔ اب محبوس وقریب ہلاکت ہوں۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب محسودِ خلائق غنی اور صحیح وسالم تھا۔ اب اپاہج اور زخمی ہوں۔ بڑی سخت مصیبتیں اور بیسیوں صعوبتیں جھیلنا پڑ رہی ہیں۔

ٹوٹی ہوئی ہڈی جس طرح لکڑی اور پٹی کا بوجھ اٹھاتی ہے اسی طرح ہم بھی ناقابل برداشت مصیبتیں اٹھا رہے ہیں۔

ان تمام مصائب کے باوجود اللہ کے فضل واحسان کا شکر گذار ہوں۔ کیوں کہ اپنی آنکھوں سے دوسرے قیدیوں کو بیمار ہوتے ہوئے بھی، بیڑیاں پہنے ہوئے زنجیروں میں کھینچے جاتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ انھیں لوہے کی بیڑیوں اور زنجیروں میں ایک سخت، تیز اور غلیظ انسان کھینچتا ہے۔ محنت ومہنت، کینہ وعداوت کا پورا مظاہرہ کرتا ہے۔ تکلیفوں پر تکلیفیں پہنچاتا اور بھوکے پیاسے پر بھی رحم نہیں کھاتا ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ اس نے ان آفات وتکالیف سے محفوظ رکھا۔ میرے دشمن میری ایذارسانی میں کوشاں اور میری ہلاکت کے درپے رہتے ہیں۔ میرے دوست میرے مرض کے مداوا سے لاچار ہیں۔ دشمنوں کے دل میں میری طرف سے بغض وکینہ مذہبی عقائد کی طرح راسخ ہوگیا ہے۔ ان کے پلید سینے کینہ وعداوت کے دفینے بن گئے ہیں۔

ان ظاہر اسباب پر نظر کرتے ہوئے میں اپنی رہائی سے مایوس اور اپنی امیدوں کو منقطع پاتا ہوں۔ لیکن اپنے رب عزیز ورحیم، رؤف وکریم کی رحمت سے ناامید نہیں ہوں۔ وہی تو جابر فرعونوں سے عاجز ضعیفوں کو نجات دلاتا ہے۔ اور وہی تو زخمی مظلومین کے زخموں کو اپنے رحم وکرم کے مرہم سے بھرتا ہے۔ وہ ہر سرکش کے لئے جبار وقہار ہے۔ ہر ٹوٹے ہوئے دل کا جوڑنے والا، ہر نقصان رسیدہ فقیر کو کامیاب بنانے والا اور ہر دشوار کو آسان کرنے والا ہے۔

اسی نے نوح (علیہ السلام) کو غرق اور ابراہیم (علیہ السلام) کو طپش وحرق، ایوب (علیہ السلام) کو مرض ومصائب، یونس (علیہ السلام) کو شکم ماہی، اور بنی اسرائیل کو بربادی وتباہی سے نجات دی۔ اسی نے موسیٰ وہارون (علیہما السلام) کو ہامان وفرعون، قارون اور عیسیٰ مسیح (علیہ السلام) کو مکرِ ماکرین، اور اپنے حبیب مصطفیٰ (ﷺ) کو دجل وفریب کفار پر غالب

کیا۔ پھر اگر مجھے مشقتوں، صعوبتوں اور حوادث و معاصی نے گھیر لیا ہے تو اس کی رحمت و فضل سے کیوں مایوس ہوں۔؟

وہی میرا رب، شافی و کافی اور خطا پوش و آمرزگار ہے۔ بہت سے بیمار جو موت کے کنارے پر پہنچ کر بھی اسے یاد کرتے ہیں شفا پاتے ہیں۔ بہت خطا کار جب استعذ ار و استغفار کرتے ہیں، مقبول بارگاہ ہوتے ہیں۔ بہت دردمند جب اسے پکارتے ہیں، مصیبت سے نجات پاتے ہیں۔ بہت مسافر جب اپنی حاجتیں پیش کرتے ہیں، مراد کو پہنچتے ہیں۔ بہت قیدی جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوتے ہیں، خلاقِ مطلق انھیں بیڑیوں اور قیدوں سے بلا فدیہ واحسان چھٹکارا دلاتا ہے۔

میں بھی مظلوم و دل شکستہ و مضطر اور مسکین و ذلیل و محتاج بن کر اسی خدائے برتر کو پکارتا ہوں۔ اس کے حبیب کو وسیلہ بنا کر اور امیدوارِ رحمت ہو کر اس کی بارگاہ میں بصد تضرع التجا کرتا ہوں۔

وہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ اس نے مظلوم و مضطر کے یاد کرنے پر اجابتِ دعوت اور کشفِ مصیبت کا وعدہ کیا ہے۔ وہی مجھے تکلیف سے نجات دے گا۔ وہی قلق و اضطراب سے آزاد کرے گا۔ وہی امراض سے شفا بخشے گا۔ وہی پکڑنے والے سے چھڑائے گا۔ وہی ظالم سے بچائے گا۔ وہی میرے گریہ و بکا پر رحم کرے گا۔ وہی میری بدبختی و شامت کو مٹائے گا۔

وہ دعا کا سننے والا، بہت دینے والا اور بلاؤں کا دفع کرنے والا ہے۔ اسی سے جلا وطنی کے غم کو دور اور بہترین نعمتوں کے عطا کرنے کی امیدیں وابستہ ہیں۔

اے میرے رب! مصیبتوں سے مجھے نجات دے۔ اے امیدواروں کی امید گاہ اور اے التجا کرنے والوں کے پناہ گاہ! اپنے حبیب امین، اس کی آل طاہرین و مبارکین اور اس کے صحابہ محافظینِ دین کے صدقے میں ہماری سُن لے۔ اے ارحم الراحمین اور احکم الحاکمین! تو ہی ظالموں سے مظلوموں کا انتقام لینے والا ہے۔ بیشک ساری تعریفیں، سارے جہاں کے پالنے والے کے لئے ہیں۔

یہ پُر درد و الم انگیز کہانی ختم ہوئی۔ میں نے اپنی مصیبت و پریشانی کا کچھ حال دو قصیدوں میں بھی لکھا ہے۔ ایک قصیدہ ہمزیہ ہے جس میں شیطانی وساوس کا ذکر ہے۔ اور دوسرا دالیہ ہے جس میں اس غمگین و معذور کی تکلیف و رنج کا تذکرہ ہے۔ ان دونوں قصیدوں کو سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مدح پر ختم کیا ہے۔

ان دونوں میں سے پہلے 'نون' کے قوافی میں بھی قصیدہ لکھا تھا جو در یتیم کی طرح فرید و یگانہ ہے۔ اس کا ہر شعر مضبوط و مرتفع قصر کی طرح ہے۔ اس کے تین سو سے کچھ زیادہ اشعار ہو کر رہ گئے۔ اس کے اِتمام کی نوبت نہیں آئی۔ مصائب و آلام کے ہجوم نے تکمیل کا موقع نہیں دیا۔ اس کا مطلع یہ ہے:

ما ناح اورق فی اوراق اشجان　　اِلا وهيج اشجانی و آشجانی

اگر اللہ نے مجھ پر رہائی سے احسان فرمایا تو اس ذات کی مدح اس میں شامل کر کے ختم کردوں گا جسے مکارمِ اخلاق سے پورا پورا حصہ ملا ہے۔ اس پر اور اس کی آل پر قیامت تک صلوٰۃ و سلام۔ و اللّٰہ سبحانہ ولی التوفیق و الاکرام۔

☆☆☆☆☆

قارئین کرام: علامہ فضل حق خیر آبادی کا قصیدۂ ھمزیہ و قصیدہ دالیہ مع اردو ترجمہ ص ۸۶ تا ۱۱۹ باغی ہندوستان مؤلفہ عبد الشاہد شیروانی مطبوعہ المجمع الاسلامی مبارک پور ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء میں ملاحظہ فرمائیں۔

....

گردشِ ایام پہ غالب ہوا ہے فضلِ حق

ایک انقلاب دہر وہ تھا کہ دہلی اور بریلی و بدایوں و مراد آباد و لکھنؤ و شاہجہاں پور وغیرہ کے ہر محاذ پر ہندوستانیوں اور بالفاظِ دیگر مسلمانوں کی شکست و پسپائی کے بعد انگریز ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر علما و امرا کو قید و جلا وطنی و قتل و غارت گری کی انسانیت سوز اور وحشت ناک سزاؤں سے دوچار کیا کرتے تھے اور ان کی آتشِ انتقام اس وقت سرد ہوئی جب ان کے سامنے سرنگوں ہو کر اہل ہند نے ان کی محکومی و غلامی کو عملاً قبول کر لیا اور کسی کے اندر یہ جرأت و جسارت باقی نہ رہ گئی کہ ان کے اقتدار و حکومت کو چیلنج کرنے کا خیال بھی ظاہر کر سکے۔

دوسرا دور اس وقت شروع ہوا جب انگریز ہندوستان کی زیر زمین مزاحمت اور بین الاقوامی حالات (جنگ عظیم اول) کے پیشِ نظر ہندوستان سے اپنا رختِ سفر باندھ کر اپنے وطن برطانیہ کے لئے کوچ کی تیاری میں لگ گئے اور یہاں ہندوستانیوں کی اپنی حکومت قائم کرنے کی خواہش ان کے دل میں انگڑائیاں لینے لگیں۔

یہ دور اس بات کا متقاضی تھا کہ اپنے ان محسنوں اور جاں بازوں کو یاد کرے، جنھوں نے بے پناہ مصائب و آلام جھیل کر انگریزوں کے پنجۂ استبداد سے استخلاص وطن اور آزادیِ ہند کی راہ میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ مگر افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا اور علما و قائدینِ انقلاب ۱۸۵۷ء کی خدمت اور قربانیوں کی صحیح اور جامع و مکمل تاریخ آج تک مرتب و مدون نہ کی جا سکی۔

حالات کی ستم ظریفی اور وقت کا المیہ ہے کہ ہندوستان سے پاکستان تک ایسے ہزاروں مخطوطات مؤرخین و محققین کی نگاہِ توجہ سے محروم ہو کر اس حد تک بوسیدگی و کہنگی کے شکار ہو چکے ہیں کہ اب ان کے بیشتر اوراق کا مطالعہ اور ان کا تحفظ بھی طرح طرح کی مشکلات کا باعث ہے۔

تیسرا زمانہ وہ آیا کہ ۱۹۲۰ء کے بعد کچھ سست رفتاری اور ۱۹۴۷ء کے بعد بڑی سرعت و تیز گامی کے ساتھ ایسی تاریخ لکھی اور پیش کی جانے لگی جس میں کچھ حقائق کے پہلو بہ پہلو اکاذیب و اباطیل کی آمیزش نہایت چابک دستی سے کی جانے لگی اور جابجا فرضی تاریخ نویسی کا

ناخوشگوار فریضہ انجام دیتے ہوئے ایسے ہوائی قلعے تعمیر کیے جانے لگے جن کی حیثیت ریت محل سے زیادہ نہیں اور تیشۂ تحقیق وتنقید کی ضرب سے وہ چند لمحات ہی میں بکھر کر اپنا وجود کھو بیٹھتے ہیں۔

صفحاتِ تاریخ میں جن علما و قائدین کو نمایاں جگہ ملنی چاہیے تھی اور جنھیں مسندِ اعزاز وافتخار پہ بٹھایا جانا چاہیے تھا ان کا ذکر سرسری اور ضمنی طور پر کیا گیا اور جن کا سرسری و ضمنی ذکر ہونا چاہیے تھا کہ ان کا کوئی سرگرم کردار یا بالکل ہی کوئی کردار اور کوئی حصہ نہیں تھا انھیں جلی سرخیوں اور افسانوی کرداروں کے ساتھ پیش کیا گیا جسے ایک تاریخی المیہ کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

حیرت بالائے حیرت یہ ہے کہ بعد کے بہت سے مسلم وغیر مسلم مؤرخین نے اسی مسخ شدہ تاریخ کو بلا تحقیق وتنقید کے آنکھ بند کر کے قبول کر لیا اور اسی بنیاد پر مبنی تاریخ کی عمارت کھڑی کرتے چلے گئے جس کا حال یہ ہے کہ اس کے مآخذ و مراجع کے مشتملات ہی جب مشکوک اور ساقط الاعتبار ہیں تو ان کا حشر ہر صاحب فکر وشعور پر خود ہی نمایاں ہے اور زبان حال سے وہ خود گویا ہے اور سننے سمجھنے والے اچھی طرح یہ حقیقت سمجھ رہے ہیں کہ — ’’کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا‘‘

تاریخ انقلاب ۱۸۵۷ء میں مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی (متوفی ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء) و علامہ فضل حق خیر آبادی (متوفی ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء) و مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی (متوفی ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۸ء) و مولانا فیض احمد عثمانی بدایونی (متوفی نامعلوم) و مولانا سید کفایت علی کافی مرادآبادی (متوفی ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۸ء) و مفتی عنایت احمد کاکوروی (متوفی ۱۲۷۹ھ/ ۱۸۶۳ء) جیسے مشاہیر علما و قائدین کا جس عظمت واہمیت کے ساتھ ذکر ہونا چاہیے تھا وہ نہیں ہو سکا اور انھیں جس طرح خراج عقیدت پیش کیا جانا چاہیے تھا وہ فریضہ ہمارے عہد کے علما و محققین و مؤرخین نہ ادا کر سکے۔

اس صورت حال میں جہاں ہماری اپنی غفلت وسستی کا دخل ہے وہیں ایک مخصوص زاویۂ نظر کے حامل گروہ کی بھی کرشمہ سازی ہے جس نے دانستہ طور پر صحیح تاریخ نویسی و تاریخ نگاری سے اعراض واغماض برتتے ہوئے اپنی کچھ پسندیدہ شخصیتوں کو نمایاں کرنے بلکہ تاریخ سازی و تاریخ گری کرنے اور قائدِ جنگ آزادی علامہ فضل حق خیر آبادی کی شخصیت کو مجروح کرنے میں اس نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔ یہ کارنامہ ایسے ’’مقدس ومحترم حضرات‘‘ کا رہینِ منت ہے جن کا احتساب کیا جائے اور حقیقت بینی وحقیقت بیانی کا مظاہرہ کیا جائے تو نتیجہ کچھ اس قسم کا برآمد ہوگا کہ:

سوچو تو سلوٹوں سے بھری ہے تمام روح
دیکھو تو اک شکن بھی نہیں ہے لباس میں

یہی بات حکیم مسعود احمد برکاتی ٹونکی (ناظم آباد، کراچی) نبیرۂ حکیم سید برکات احمد ٹونکی نے اپنے الفاظ میں اس طرح کہی ہے:

علامہ فضل حق خیر آبادی ان مظلوم محسنینِ ملت میں سے ہیں جن کی بدولت آج ہم آزادی کی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ لیکن جن کی عظمت پہچاننے سے ہم محروم ہیں۔ بلکہ بعض ''تاریخ سازوں'' نے تو اس بانیِ جدوجہد آزادی کے روشن کردار کو مسخ کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ اگرچہ ان کی یہ احسان فراموشی تاریخ کے رخِ زیبا کی چمک کو کم نہ کر سکے گی۔ (ص ۱۷۹۔ امتیازِ حق۔ از راجہ غلام محمد (لاہور) طبع پنجم المجمع الاسلامی مبارک پور ضلع اعظم گڑھ۔ یوپی۔ ۱۴۲۵ھ/۲۰۰۴ء)

علامہ فضل حق خیر آبادی کے سیاسی و سماجی نظریات پر تحقیق کرنے والی روسی مصنفہ مادام ''پولونسکایا'' ممبر ادارۂ علوم شرقیہ، سائنس اکیڈمی، سوویت یونین کی تحقیقات کی نشان دہی کرتے ہوئے مشہور روسی مصنف ''شومسکی'' نے بھی کچھ اسی سے ملتے جلتے احساسات وخیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

> ''برطانوی علم تاریخ میں ۱۸۵۷ء کی عوامی بغاوت کے بہت سے رہنماؤں اور شرکت کرنے والوں کے، خاص طور سے مولانا فضل حق خیر آبادی کے نظریات کو جس طرح مسخ کیا ہے پھر بعض جدید مطبوعات میں جو غلط تصور پیش کیا گیا ہے اس نے اور خود اس عوامی بغاوت کو ''غدر'' اور ''مٹھی بھر انگریز دشمن جاگیرداروں کی بغاوت'' کا نام دینے کی روش نے مادام ''پولونسکایا'' کو ان مسائل کے غائر مطالعہ پر اکسایا۔ (سوویت دیس، دہلی۔ ۱۰/جولائی ۱۹۵۸ء)

یہ علامہ فضل حق خیر آبادی وہ ہیں جن کے فضل وکمال کے روشن نقوش آپ زیر نظر کتاب کے صفحات پر جابجا دیکھیں گے اور آپ کی جامعیتِ علوم وفنون کا یہ عالم تھا کہ:

> در علوم منطق وحکمت وفلسفہ وادب وکلام واصول وشعر فائق الاقران و استحضارے فوق البیان داشت۔ نظمش زاید بر چہار ہزار اشعار خواہد بود۔

الخ (ص ۱۶۴۔ مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۹۱۴ء۔ وترجمہ اردو بر ص ۳۸۳۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی ۱۹۶۱ء)

''مولوی فضل حق بن مولوی فضل امام خیرآبادی عالم اجل اور فاضل بے بدل، حاوی اصول وفروع وجامع معقول ومنقول تھے...... اساتذۂ وقت آپ کی شاگردی فخر جانتے تھے۔...... مولانا کو علم فلسفہ اور ادب میں یدِ طولیٰ تھا۔ (ص ۱۴۸۔ روضۃ الادبا از مولوی محمد الدین فوق)

...... مولانا فضل حق خیرآبادی تھے جن کے دم عیسوی نے معقولات میں روح پھونکی کہ ابن سینائے وقت مشہور ہوئے۔ دیار اطراف کے طلبہ نے ان کی طرف رجوع کیا اور منطق وفلسفہ کو نئے طور سے ملک میں رواج دیا۔ غدر کے ہنگامہ میں گرفتار ہوکر جزیرۂ انڈمان بھیجے گئے اور وہیں ۱۲۷۸ھ میں وفات پائی۔

...... مولانا فضل حق کے تلامذہ اور تلامذہ در تلامذہ نے سارے ملک میں پھیل کر علوم معقول کو بڑی رونق دی اور بڑے باکمال مدرس ثابت ہوئے۔ (ص ۲۳۔ حیات شبلی از سید سلیمان ندوی۔ مطبوعہ دار المصنفین اعظم گڈھ، یوپی)

علامہ کی جرأتِ کردار کا عالم یہ تھا کہ مقدمہ لکھنؤ ۱۸۵۹ء میں جب کہ آپ خود اپنے مقدمہ کی وکالت کر رہے تھے اور رہائی کے پورے پورے آثار تھے۔ فضلِ حق شاہجہاں پوری کی کچھ باتیں آپ کے خلاف بطورِ الزام شامل کرنے کی وجہ سے فضل حق خیرآبادی کو اس فرد جرم سے علیحدہ کیے جانے کے امکانات روشن تھے۔ انگریز جج آپ سے اس بنیاد پر کچھ ہمدردی بھی رکھتا تھا کہ اس نے کسی زمانے میں آپ سے کچھ سیکھا تھا اس کے باوجود آپ نے کمالِ جرأت و ہمت کے ساتھ انگریزوں کے خلاف دیے گئے اپنے فتوائے جہاد کا بھری عدالت میں برملا اعتراف و اعلان کرتے ہوئے کہا کہ:

''ہاں وہ فتویٰ صحیح ہے۔ وہ میرا لکھا ہوا ہے اور آج بھی میں اپنے اس فتویٰ پر قایم ہوں۔''

اس سلسلے میں زیرِ نظر کتاب کے اندر کافی اطمینان بخش مواد آگیا ہے۔ مزید برآں دو نئے حوالے سرِ دست ملاحظہ فرماتے چلیں:

''ان تمام مناصبِ جلیلہ کے بعد مولانا کی دینی آزمائش کا وقت آیا اور غدر ۱۸۵۷ء کے بعد مولانا بھی باغی قرار دیے گئے۔ ۱۸۵۹ء میں سلطنتِ

مغلیہ کی وفاداری یا فتوائے جہاد کی پاداش یا جرمِ بغاوت میں مولانا ماخوذ ہو کر سیتا پور سے لکھنؤ لائے گئے۔ مقدمہ چلا تو رہائی کے بہت سے اسباب اگرچہ پیدا ہو گئے تھے لیکن مولانا نے خود فتویٰ کی تصدیق نہایت جرأتِ ایمانی سے کردی اس لئے عبور دریائے شور کی سزا ہوئی اور وہ جزیرہ انڈمان روانہ کردیے گئے۔ (ص ۳۳۲۔ حکمائے اسلام جلد دوم۔ مؤلفہ مولانا عبدالسلام ندوی۔ دارالمصنفین اعظم گڈھ۔ یوپی)

''انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ آپ کے ایما پر تیار ہوا اور اس پر آپ کے دستخط تھے۔ کردار اتنا بلند تھا کہ اس ''جرم'' کی پاداش میں جب مقدمہ چلا تو گواہ اسے ثابت نہ کرسکے۔ مگر مولانا نے خود اس کا اعتراف کرلیا اور اسی حق گوئی کی بنا پر جزیرہ انڈمان بھیجے گئے اور وہیں وفات پائی۔ (روزنامہ نوائے وقت لاہور۔ شمارہ ۱۳ر دسمبر ۱۹۷۹ء۔ بقلم میاں عبدالرشید کالم نگار بعنوان ''نور بصیرت'' نوائے وقت)

انقلاب ۱۸۵۷ء کے دوران بہادر شاہ ظفر نے جو سہ نفری کنگ کونسل بنائی تھی اس میں علامہ فضل حق خیرآبادی و جنرل بخت خاں روہیلہ اور مولوی سرفراز علی شامل تھے۔ اس کنگ کونسل کو پریوی کونسل بھی کہا گیا ہے۔ یہ بیان سید مبارک شاہ رام پوری کوتوال شہر دہلی در ۱۸۵۷ء کا ہے۔ (ص ۱۲۸ و ۱۸۳۱۔ دی گریٹ ریوولیشن آف ۱۸۵۷ء از ڈاکٹر سید معین الحق، کراچی)

علامہ فضل حق خیرآبادی اور بہادر شاہ ظفر کے باہمی روابط و مشاورت کا ذکر کرتے ہوئے حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی (کراچی) نبیرۂ حکیم سید برکات احمد ٹونکی لکھتے ہیں:

......مولانا فضل حق خیرآبادی نے جب ۱۸۳۱ء میں دہلی کی سررشتہ داری سے مستعفی ہو کر دہلی کا قیام ترک کیا۔ اور ریاست جھجھر تشریف لے جانے لگے تو:

ولی عہد سلطنت صاحب عالم مرزا ابوظفر بہادر شاہ نے اپنا دوشالہ علامہ کو اڑھایا اور بوقت رخصت آبدیدہ ہو کر کہا۔

چوں کہ آپ جانے کے لئے تیار ہیں میرے لئے بجز اس کے کوئی چارۂ کار نہیں کہ میں بھی اس کو منظور کرلوں مگر خدا علیم ہے کہ لفظ وداع زبان پر لانا دشوار ہے۔ (ص ۱۴۸۔ کلیاتِ نثرِ غالب)

مولانا فضل حق بہادر شاہ سے برابر ملاقاتیں کرتے رہے اور ان کی توجہ وقت کے اہم مسائل کی طرف دلاتے رہے اور ان کے حل کے سلسلے میں اپنے مخلصانہ مشورے بھی دیتے رہے۔ اور بہادر شاہ اس اعتماد کی بنا پر جو اسے مولانا کے اخلاص اور ان کی اِصابتِ رائے پر تھا ان مشوروں پر عمل کیا کرتے تھے۔ مثلاً

ایک ملاقات جو غالباً ۱۲ر مئی ۱۸۵۷ء کو ہوئی اس کی تفصیل حکیم احسن اللہ خاں نے اپنی یادداشتوں میں دی ہے۔ (ص ۲۳ و ۲۴۔ میموریز آف حکیم احسن اللہ خاں۔ مرتبہ ڈاکٹر سید معین الحق کراچی ۱۹۵۸ء) اس ملاقات میں جن مسائل پر گفتگو ہوئی وہ یہ ہیں:

(۱) مجاہدین کی اِعانت۔ روپیہ اور سامانِ رسد سے۔

(۲) اہل کار حکام کا تقرر

(۳) مال گذاری کی تحصیل کا انتظام

(۴) ہمسایہ والیانِ ریاست کو جنگ میں اعانت وشرکت کی دعوت۔

چوں کہ مجاہدین کی مالی اعانت، مال گذاری کی تحصیل اور والیانِ ریاست کی مالی اعانت پر موقوف تھی اس لئے حکیم صاحب کے بیان کے مطابق:

بادشاہ نے حکم دیا کہ مولوی صاحب کی تجویز کے مطابق والیانِ ریاست کو پروانے لکھے جائیں اور بعجلت روانہ کردیے جائیں۔

قابل اعتماد اور کارداں حکام کے تقرر کے سلسلے میں مولانا نے اپنے اعزہ کی خدمات پیش کی تھیں۔ چنانچہ دو اہم مناصب پر مولانا کے دو اعزّہ مقرر کیے گئے۔

(۱) مولانا عبدالحق خیرآبادی:— آپ مولانا فضل حق کے فرزند گرامی تھے اور غدر سے پہلے الور میں ایک اہم عہدے پر فائز تھے۔ مولانا عبدالحق گوڑگانوہ (میوات) کے کلکٹر مقرر کیے گئے۔ (ص ۲۲۲۔ غدر کی صبح وشام از منشی جیون لال۔ ص ۱۳۱۔ غدر کے گرفتار شدہ خطوط۔ ص ۱۶۸ و ۱۶۹۔ تاریخ عروجِ سلطنت انگلشیہ از منشی ذکاء اللہ دہلوی)

(۲) میر نواب (مولانا فضل حق کے داماد سید احمد حسین رسؔوا (مضطر خیرآبادی و بسمؔل خیرآبادی کے والد) فرزند سید تفضّل حسین کے حقیقی بھائی) کو اسی روز (۱۲ر مئی) دہلی کا گورنر مقرر کیا گیا (ص ۱۰۲۔ روزنامچہ منشی جیون لال)

مولانا فضل حق کو بہادر شاہ کی طرف سے جو اختیارات حاصل تھے اور انتظامی امور میں جو دخل تھا اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ بہت سے حکام کا تقرر مولانا نے براہ راست بھی کیا تھا۔ حکیم احسن اللہ کا بیان ہے کہ:

مولوی فضل حق نے بھی کئی تحصیل داروں کو ضلع دار کی نیابت میں مقرر کیا۔ (ص ۲۵۶۔ بہادر شاہ کا مقدمہ۔ بیان حکیم احسن اللہ خاں)

اس طرح لال قلعہ کے دارالانشا (سکریٹریٹ) سے مولانا کے حکم سے پروانے جاری ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ بہادر شاہ کا پرائیویٹ سکریٹری مکند لال اپنی ایک تحریر (مؤرخہ ۱۸ اگست ۱۸۵۷ء میں لکھتا ہے کہ:

بہادر شاہ کے دربارِ عام سے اپنے کمرۂ خاص میں چلے جانے کے بعد مولانا نے حسب ذیل افراد کے نام پروانے جاری کرنے کا حکم دیا:

(۱) بنام حسن بخش عرض بیگی۔ ضلع علی گڑھ کی آمدنی وصول کرنے کے لئے۔

(۲) بنام فیض محمد (غالباً مولانا فیض احمد بدایونی)۔ ضلع بلند شہر اور علی گڑھ کی آمدنی وصول کرنے کے لئے مقرر کیا گیا۔

(۳) بنام ولی داد خاں۔ مذکورہ دونوں آدمیوں کو، آمدنی وصول کرنے میں مدد دینے کے لئے۔

(۴) بنام مولوی عبدالحق۔ ضلع گوڑگانوہ کی مال گذاری وصول کرنے کا انتظام کیا جائے۔

(ص ۲۹ و مابعد۔ غدر دہلی کے گرفتار شدہ خطوط۔ (ص ۳۸ تا ۴۱۔ فضل حق خیر آبادی اور ۱۸۵۷ء۔ مؤلفہ حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی۔ مطبوعہ کراچی ۱۹۷۵ء)

حکیم احسن اللہ خاں (بہادر شاہ ظفر کا مشیرِ خاص) اپنی یادداشت میں لکھتا ہے:

''مولوی (فضل حق) صاحب جب بھی بادشاہ کے پاس آتے بادشاہ کو مشورہ دیتے کہ جہاد کی مہم میں اپنی رعایا کی ہمت افزائی کریں اور ان کے ساتھ باہر بھی نکلیں۔ فوجی دستوں کو حتی الامکان بہتر معاوضہ دیں۔ ورنہ انگریز جیت گئے تو نہ صرف خاندانِ تیمور بلکہ تمام مسلمان نیست و نابود ہو جائیں گے۔''

(Memories of Hakeem Ahsanullah Khan, Edited by

S. Moinul Haq. Pakistan Historical Society, Karachi 1958. P.24)

جولائی ۱۸۵۷ء میں علامہ فضل حق خیرآبادی نے شاہجہانی جامع مسجد دہلی میں انگریزوں کے خلاف جو ولولہ انگیز تقریر کی اور جہاد کا فتویٰ مرتب کر کے تصدیقاتِ علما کے بعد اسے مشتہر کرایا اور انقلابیوں میں ایک نیا حوصلہ اور امنگ پیدا کر کے انگریزوں سے بھر پور ٹکر لینے کی جو تاریخ ساز خدمت انجام دی اس کا ذکر اس دور کے ایک مؤرخ منشی ذکاء اللہ دہلوی اور بعد کے بے شمار محققین ومؤرخین نے کیا ہے جسے آپ زیرِ نظر کتاب کے آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

ایک گراں قدر کام علامہ فضل حق خیرآبادی نے یہ کیا کہ شاہی کابینہ اور مجلس انتظامی کا دستور العمل بھی ۱۸۵۷ء ہی میں مرتب فرمایا جو اس بات کا واضح اعلامیہ تھا کہ انگریزوں کے پنجۂ استبداد سے ملک کو نجات دلا کر مغل فرماں روا اسی دستور العمل کے مطابق نظام حکومت چلائیں گے۔ یہ دستور العمل بھی اسی کتاب کے آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

۱۸۰۳ء سے دہلی میں یہ ڈنکا پیٹا جاتا تھا کہ:

''خلقت خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی بہادر کا''

یہ نعرہ بدل کر ۱۲ رمئی ۱۸۵۷ء سے اس طرح ڈنکا پیٹا جانے لگا کہ

''خلقت خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم بادشاہ کا''

علامہ فضل حق خیرآبادی نے مغل سلطنت کے استحکام ومرکزیت کے لئے جو دستور العمل ترتیب دیا تھا اس کا ذکر منشی ذکاء اللہ دہلوی نے اپنی کتاب ''تاریخ عروج سلطنتِ انگلیشہ'' (ص ۶۸۷) میں اس طرح کیا ہے:

> ''مولوی صاحب عالم متبحر مشہور تھے۔ وہ الور سے ترکِ ملازمت کر کے دہلی آئے تھے۔ انھوں نے بادشاہ کے لئے ایک دستور العمل سلطنت لکھا تھا۔''

حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی (کراچی) اس دستور العمل کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

> ''اس دستور کی بنیاد پر جو ظاہر ہے کہ اصولی اور اسلامی احکام پر مشتمل ہوگا، ایک مجلس منتظمہ (جلسۂ انتظام) تشکیل دی گئی اور بقول مہدی حسین (ص ۱۸۲۔ بہادر شاہ دوم) اس کا ڈائرکٹر (نگراں) مولانا کو بنایا گیا۔ اس مجلس انتظامیہ کے قواعد وضوابط (بائی لاز) کا مسودہ اتفاق سے محفوظ رہ

گیا ہے۔ بھارت کے نیشنل آرکائیوز میں وہ مسودہ محفوظ ہے۔ (For Pol. Cons. N.A. Box 57-No.539-541) اور اس کا عکس ہمارے پیش نظر ہے۔

یہ تحریر اردو میں ہے اور اس نقطۂ نظر سے بھی تاریخی اہمیت کی حامل ہے کہ اس نوع کے اجتماعی اور دستوری مسائل پر یہ غالباً پہلی اردو تحریر ہے۔ اور اس کے مطالعہ سے سیاسی مسائل اور انجمنوں واداروں کے سلسلے میں اردو اصطلاحات میں عہد بہ عہد تغیرات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ (ص ۵۳، ۵۴۔ فضل حق خیرآبادی اور ۱۸۵۷ء۔ از محمود احمد برکاتی)

آج کل کی اصطلاح میں اسے آپ کابینہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ملک کا جو دستور مرتب کیا گیا تھا اس دستور کی روشنی میں جو کابینہ تشکیل پانا تھی، یہ اس کابینہ کے بائی لاز ہیں کہ یہ کابینہ کس طرح فیصلے کرے؟ اس کی ہیئت کیا ہو؟ وغیرہ۔ چنانچہ قواعد وضوابط کے پہلے ہی جملے میں ہے:

> ''ازاں جا کہ واسطے رفع برہمی سررشتہ اور موقوفی بدانتظامی طریقہ فوجی و ملکی کے مقرر ہونا دستور العمل کا واجب اور مناسب اور واسطے عمل درآمد دستور کے اولاً متعین ہونا کورٹ کا ضروری ہے اس لئے حسب ذیل قواعد لکھے جاتے ہیں۔''

یعنی قیامِ نظم و امن کے لئے دستور کا ہونا ضروری ہے اور دستور پر عمل درآمد کورٹ ہی کرسکتا ہے۔ اس لئے کورٹ کے قواعد منضبط کیے جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ یہ دستور نہیں بلکہ دستور کو نافذ ور وبعمل کرنے والے کورٹ کے قواعد ہیں۔

یہ کورٹ دس ارکان پر مشتمل تھا جن میں ۶ فوج کے نمائندے تھے اور ۴ شہری۔ فوج کے نمائندے تین قسم کی فوجوں، پیادہ (انفنٹری) سوار (کیویلری) اور توپ خانہ (آرٹلری) میں سے دو دو منتخب ہونے تھے۔ ۴ شہری ارکان کے لئے قواعد میں کوئی وضاحت نہیں ہے کہ ان کا معیار انتخاب کیا ہوگا؟ نہ مولانا کے سوا کسی اور شہری رکن کا نام کہیں نظر سے گذرا۔

انگریزوں کے مخبر تراب علی نے یکم ستمبر ۱۸۵۷ء کو ''دہلی کی خفیہ خبروں'' کے عنوان سے جو مراسلہ انگریز حکام کو بھیجا تھا اس میں اس کورٹ کی تشکیل کی خبر کے ساتھ کورٹ کے فوجی ارکان کی فہرست دی ہے اور آخر میں لکھا ہے:

''مولوی فضل حق بھی اس کے ایک رکن ہیں۔'' (میوٹنی ریکارڈ۔ جلد ۱۱۔ حصہ ۱۱۔ ۸/۹ و سکریٹریٹ لیٹرس نمبر ۱۱۹۔ مورخہ ۷ر ستمبر ۱۸۵۷ء)

ممکن ہے باقی ۳ شہری ارکان کی شمولیت مختلف مصالح اور مجبوریوں کے پیشِ نظر معرضِ التوا بں پڑ گئی ہو اور غیر فوجی رکن صرف مولانا فضل حق ہی رہے ہوں جو اس دستور کے مصنف اور رتب تھے جس کی بنیاد پر یہ کورٹ تشکیل دیا گیا تھا۔

اس کورٹ کے ارکان کو جو حلف اٹھانا پڑتا تھا اس سے اس کے دائرۂ کار، اختیارات کی سعت اور حدودِ اختیارات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ حلف یہ تھا:

''کام کو بڑی دیانت اور امانت سے بلا رو رعایت کمالِ جاں فشانی سے اور غور و فکر سے سرانجام کریں گے اور کوئی دقیقہ دقائق متعلقۂ انتظام سے فرو گذاشت نہ کریں گے اور حیلۃً وصراحۃً اخذِ اجر یا رعایت کسی طرح کسی لحاظ سے وقت تجویز امور انتظام کورٹ میں نہ کریں گے، بلکہ ہمیشہ ساعی اور سرگرم ایسے انتظام امورات سلطنت میں مصروف رہیں گے کہ جس سے استحکام ریاست اور رفاہ اور آسائشِ رعیت ہو اور کسی امر مجوزۂ کورٹ کو بے اجازت کورٹ اور صاحب عالم (مرزا مغل) قبل اجرا اس کے صراحتاً یا کنایۃً کسی پر ظاہر نہ کریں گے۔''

اس حلف سے اندازہ ہوتا ہے کہ

(۱) کورٹ کی مدت کار صرف ہنگامی حالات اور زمانۂ جنگ تک محدود نہیں ہے بلکہ زمانۂ ابعد جنگ (اغیار سے استخلاصِ وطن) کے مسائل بھی پیشِ نظر ہیں۔

(۲) صرف دہلی اور جنگ سے متاثرہ علاقے تک اس کورٹ کا دائرۂ کار محدود نہیں ہے بلکہ سلطنت، ریاست (اسٹیٹ) جیسے الفاظ بتاتے ہیں کہ پورے ملک کا انتظام مقصود ہے۔

ان قواعد میں سب سے اہم بات وہ ہے جس کی طرف ہم پہلے توجہ دلا چکے ہیں کہ اس کے ریعے بادشاہ کو بے اختیار اور صرف آئینی سربراہ بنا دیا گیا ہے۔ دفعہ ۶ میں ہے:

''جو امورات انتظام کے پیش آئیں اول تجویز ان کی کورٹ میں ہوگی اور

بعد منظوری صاحب عالم بہادر کے اطلاع رائے کورٹ سے حضور والا میں
ہوتی رہے گی۔''

اس طرح اصل فیصلہ کورٹ کرے گا جس کو صاحبِ عالم (مرزا مغل جو کمانڈر انچیف تھے) منظور کر کے بادشاہ کو صرف اس کی اطلاع کر دیں گے۔

دفعہ نمبر ۷ میں ہے کہ کورٹ کے ہر فیصلے کے نفاذ کے لئے صاحبِ عالم کی منظوری اور حضور والا (بادشاہ) کی اطلاع ضروری ہے مگر جب کسی فیصلے سے صاحب عالم کو اتفاق نہ ہو تو وہ کورٹ کو واپس کر دیں گے اور کورٹ اس پر نظر ثانی کر کے پھر صاحب عالم کو بھیج دے مگر صاحب عالم کا کام صرف یہ ہوگا کہ وہ اس فیصلے کو حضور والا تک پہنچا دیں اور اس صورت میں حضور والا کا فیصلہ ناطق ہوگا۔

بہادر شاہ کو اپنے اختیارات پر یہ قدغن پسند نہیں تھی اور ہونی بھی نہیں چاہیے تھی۔ اگر انھیں مستقبل کے ہولناک واقعات کا وہ اندازہ ہوتا جو مولانا فضل حق کو تھا تو یہ جدو جہد ناکام ہی کیوں ہوتی؟ چنانچہ انھوں نے گرفتار ہونے کے بعد فوجی عدالت کے سامنے جو بیان دیا تھا اس میں اس کورٹ کا بھی ذکر کیا تھا۔

> ''باغی سپاہ نے ایک کورٹ قائم کیا تھا جہاں تمام معاملات کے فیصلے ہوتے تھے اور جن معاملات کو وہاں طے کیا جاتا تھا انھیں کو یہ کونسل اختیار کرتی تھی، لیکن میں نے ان کی کانفرنس میں شرکت نہیں کی۔ (ص ۱۳۶۔ بہادر شاہ کا مقدمہ)

ایک بار لال قلعہ کے ایک حصے میں مجاہدین کا قیام بہادر شاہ کو گوارا اور مناسب معلوم نہ ہوا تو مرزا مغل کو لکھا کہ: کورٹ کے ممبران سے انھیں ہٹانے کے لئے کہو۔ (گرفتار شدہ خطوط)

شاہ زادگان عالی تبار کو بھی یہ دخل در معقولات بہت ناگوار تھا۔ چنانچہ ان کے بھی کئی شکایت نامے اوراقِ تاریخ نے ''وقت ضرورت'' کام میں لانے کے لئے سینے سے لگا رکھے ہیں۔

(ص ۸۱و۸۲۔ گرفتار شدہ خطوط) (ص ۵۵ تا ۵۹۔ فضل حق خیر آبادی اور ۱۸۵۷ء۔ حکیم محمود احمد برکاتی)

مذکورہ دستورِ العمل کی نقل سریندر ناتھ سین کی کتاب (Eighteen Fifty Seven) اور ڈاکٹر مہدی حسین کی کتاب (Bahadurshah and the War of 1857 in Delhi) میں بھی موجود ہے۔

ملک وملت وامور سلطنت ورفاہِ خلق سے علامہ فضل حق خیرآبادی کی دل چسپی کوئی نئی نہیں تھی بلکہ آغازِ امر ہی سے تھی۔ چنانچہ انقلاب ۱۸۵۷ء سے تقریباً تیس (30) سال پہلے اکبر شاہ ثانی (متوفی ۱۸۳۷ء) کے نام رعایائے شہر دہلی کے نمائندہ وترجمان کی حیثیت سے جو درخواست علامہ فضل حق نے تقریباً ۱۸۲۶ء میں پیش کی تھی اس سے آپ کی دور اندیشی اور سیاسی بصیرت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہ درخواست بزبان ''فارسی'' ہے جو نوائے ادب بمبئی جلد ۱۳۔ شمارہ ۳/ جولائی ۱۹۶۲ء میں شائع ہو چکی ہے۔ حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی نے اپنی مذکورہ کتاب کے ضمیمہ (ص ۹۱ تا ۹۴) میں اس کو شائع کر دیا ہے۔ جس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

''یہاں کے باشندے ہندو ہوں یا مسلمان، ملازمت، تجارت، زراعت، حرفت، زمینداری اور دریوزہ گری پر معاش رکھتے ہیں۔ انگریزوں کی حکومت کے قیام سے معاش کے یہ تمام وسائل مسدود و مفقود ہو گئے ہیں۔ ملازمت کے دروازے شہریوں پر بند ہیں۔ تجارت پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ کپڑا، سوت، ظروف اور گھوڑے وغیرہ تک وہ فرنگ سے لے کر خود فروخت کر کے نفع کماتے ہیں۔ معافی داروں کی معافیاں ضبط کر لی گئی ہیں۔ کسانوں کو محاصل کی کثرت نے بدحال کر دیا ہے۔

ان چاروں طبقوں کی زبوں حالت کے نتیجے میں اہل حرفہ اور ان کے سب کے نتیجے میں دریوزہ گر تنگیِ معاش کے شکار ہیں۔

دہلی میں ہوڈل وغیرہ بہت سے پرگنے جاگیر میں شامل تھے اور جاگیرداروں کے یہاں ہزاروں آدمی فوج، انتظامی امور اور شاگرد پیشہ کی خدمت پر مامور تھے۔ اب یہ پرگنے اور دیہات و مواضعات انگریزوں نے ضبط کر لیے ہیں اور لاکھوں کسان بے روزگار ہو گئے ہیں۔

بیواؤں کی معاش چرخہ کاتنے، رسیاں بٹنے اور چکی پیسنے پر موقوف تھی۔ اب رسّی کی تجارت حکومت (کمپنی) نے اپنے ہاتھ میں لے لی ہے اور ہاتھ کی چکیوں کی جگہ پن چکیاں لگ گئی ہیں تو یہ ذریعۂ معاش بھی جاتا رہا۔

عوام کی اس بے بضاعتی اور بے روزگاری کی وجہ سے اہل حرفہ اور ساہوکار بے روزگار اور رزق سے محروم ہو گئے ہیں۔

ان سب پر مستزاد چارلس مٹکاف نے یہ حکم دیا ہے کہ غریب زرِ چوکیداری ادا کریں۔ (ولایات متحدہ اودھ وآگرہ میں ۱۸۱۴ء میں چوکیدارہ ٹیکس کا قانون نافذ ہوا۔ اسی دوران یا چند

سال بعد دہلی میں بھی یہ قانون نافذ کیا گیا۔ حاشیۂ کتاب)

دوسرا حکم یہ ہوا کہ ہر گلی کے دروازے پر پھاٹک لگایا جائے جس کا کوئی فائدہ معلوم و متصور نہیں ہے۔

تیسرا حکم یہ ہوا ہے کہ ان پھاٹکوں کے کھلنے اور بند ہونے کے اوقات مقرر ہوں جس سے بھی مشکلات کا سامنا ہے۔

چوتھا حکم یہ ہوا ہے کہ ہر محلے میں پانچ پانچ پنچ مقرر کیے جائیں''۔

اس درخواست سے جہاں مولانا فضل حق خیرآبادی کی سیاسی بصیرت اور عوام کے مسائل اور شہری زندگی کی مشکلات پر ان کی گہری نگاہ کا ثبوت ملتا ہے وہاں یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ انھوں نے ان تمام مشکلات و مصائب کے سرچشمہ پر انگلی رکھ کر صحیح تشخیص کر لی تھی۔ اور اسباب کا تجسس کر کے اس کا تعین فرما دیا تھا کہ یہ سارے مسائل غیر ملکی حکمرانوں کے پیدا کردہ ہیں۔

پھر یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ درخواست دہلی کے ریزیڈنٹ کے نام نہیں ہے جو شہر و ضلع کا حقیقی (عملاً) حاکم تھا۔ بلکہ ''حضور جہاں پناہ'' کے نام ہے۔ یعنی ساکنانِ دہلی کے مسائل لال قلعہ کے بے اختیار و محروم اقتدار مغل ''شہنشاہ'' (اکبر شاہ ثانی) کے سامنے پیش کی گئی ہے۔ حالاں کہ لال قلعہ ۱۸۰۳ء سے ویران تھا اور اکبر شاہ ثانی کے والد شاہِ عالم کی حکومت دہلی سے پالم تک رہ گئی تھی۔ اکبر شاہ ثانی کی تو صرف لال قلعہ تک محدود تھی۔ خود ''شہنشاہ'' نے کمپنی کی وظیفہ خواری پر قناعت کر لی تھی اور عوام بھی اپنی تمام ضروریات کے سلسلے میں نئے حکمرانوں کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ (ص ۲۴ تا ۲۶۔ فضل حق خیرآبادی اور ۱۸۵۷ء۔ از محمود احمد برکاتی ٹونکی۔ مطبوعہ کراچی ۱۹۷۵ء)

باشندگانِ شہر دہلی کے نمائندہ کی حیثیت سے علامہ فضل حق خیرآبادی کی طرف سے اکبر شاہ ثانی کی خدمت میں پیش کردہ درخواست پر ایک جامع اور فکر انگیز تبصرہ کرتے ہوئے حکیم محمود احمد برکاتی ٹونکی مزید تحریر فرماتے ہیں:

''ان حالات میں برصغیر کا ایک عالم دین۔ جس کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ سیاست نہیں جانتا — عوام کو دوبارہ لال قلعہ کے پھاٹک کی طرف لیے جا رہا ہے اور ان کی طرف سے درخواست لکھ کر اور ان کے حالات و خیالات کا ترجمان بن کر ان کو ''حضور جہاں پناہ'' کے دیوانِ عام میں لا کھڑا کر دیتا ہے۔

اور اس طرح ایک پیچیدہ نفسیاتی تحریک چلاتا ہے جس سے ایک طرف عوام کو دوبارہ اپنے

جانے پہچانے مرکزِ حکومت سے گرہ کشائی اور حلِ مشکلات کی توقعات پیدا ہوں گی۔

دوسری طرف خود ان "جہاں پناہ" کی خودی کے بیدار ہونے کے امکانات ابھریں گے اور ان کی غیرت وحمیت بھی ممکن ہے انگڑائی لے کر جاگ اٹھے۔

تیسری طرف برطانوی حکومت کے کارکن چونکیں گے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ سمتِ قبلہ پھر تبدیل ہو رہی ہے۔ اور وہ چونک کر ایک طرف تو ان مشکلات پر توجہ دیں گے۔ دوسری طرف شاہ کے ساتھ اپنے رویہ میں نرمی اختیار کریں گے اور ان گستاخیوں اور اہانت کوشیوں کو لگام دیں گے جن کا سلسلہ انھوں نے کئی سال سے شروع کر رکھا تھا۔ (ص ۲۷۔ فضل حق خیر آبادی اور ۱۸۵۷ء۔ از حکیم محمود احمد برکاتی)

یہ ہے اصل تاریخ انقلاب کا وہ تسلسل جسے علامہ فضل حق خیر آبادی کی دور بیں نگاہوں نے اپنی خداداد ذکاوت وفطانت واستقامت وبصیرت سے دار السلطنت دہلی کی سرزمین پر رقم کی ہے مگر اس تاریخ کو شعوری یا غیر شعوری طور پر ڈیڑھ صدی سے مٹانے، چھپانے، بھلانے بلکہ اپنے خون جگر سے اس تاریخ کو رقم کرنے والے فرزندِ عظیم وبطلِ جلیل کی شخصیت وحیثیت کو مجروح و داغ دار کرنے کی بھی مذموم کوشش کی جا رہی ہے۔ اس غفلت شعاری واحسان ناشناسی ومحسن کشی پر رئیس احمد جعفری ونادم سیتاپوری جیسے حضرات بھی اپنا درد وکرب نہ چھپا سکے اور انھیں لکھنا پڑا کہ:

"مولانا فضل حق خیر آبادی ایک یگانۂ روزگار عالم تھے۔ عربی زبان کے مانے ہوئے ادیب اور شاعر تھے۔ علوم عقلی کے امام اور مجتہد تھے۔ اور ان سب سے بالا ان کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ بہت بڑے سیاست داں، مفکر اور مدبر بھی تھے۔ مسندِ درس پہ بیٹھ کر وہ علوم وفنون کی تعلیم دیتے تھے اور ایوانِ حکومت میں پہنچ کر وہ دور س فیصلے کرتے تھے۔ وہ بہادر اور شجاع بھی تھے۔

"غدر" کے بعد نہ جانے کتنے سورما اور رزم آرا ایسے تھے جو گوشۂ عافیت کی تلاش میں مارے مارے پھرتے تھے، لیکن مولانا فضل حق ان لوگوں میں تھے جو اپنے کیے پر نادم و پشیماں نہیں تھے۔ انھوں نے سوچ سمجھ کر میدان میں قدم رکھا تھا اور اپنے اقدام وعمل کے نتائج بھگتنے کے لئے وہ حوصلہ مندی اور دلیری کے ساتھ تیار تھے۔ سراسیمگی، دہشت، اور خوف یہ ایسی چیزیں تھیں جن سے مولانا بالکل ناواقف تھے۔

مولانا کی شخصیت، سیرت، کردار اور علم وفضل پر ضرورت تھی کہ ایک مفصل کتاب لکھی جاتی۔ لیکن وہ ایک زود فراموش قوم کے فرد تھے۔ فراموش کر دیے گئے، اور کچھ دنوں کے بعد لوگ حیرت

سے دریافت کریں گے کہ۔ یہ کون بزرگ تھے؟ (ص ۸۵۴۔ بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد۔ مؤلفہ رئیس احمد جعفری، طبع اول۔ کتاب منزل لاہور)

''انگریز اور ان کے ہوا خواہ تو مولانا (فضل حق خیر آبادی) سے اس لئے ناراض تھے کہ انقلاب ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں کسی نہ کسی نہج (بلکہ قائدانہ حیثیت سے۔اختر مصباحی) سے ان کا نام آگیا۔لیکن خود مسلمانوں کا ایک ''پروپگنڈسٹ گروپ'' مولانا سے اس لئے بےزار تھا کہ وہ ان کے مذہبی نظریات کے خلاف عالمانہ مجاہدہ کر چکے تھے۔

یہ باوقار علمی مباحثے کوئی ذاتی اور عامیانہ جنگ نہیں تھی جس کا سہارا لے کر مولانا خیر آبادی کے خلاف ایک مستقل محاذ قائم کر دیا جاتا۔لیکن ہوا کچھ ایسا ہی''۔ (ص ۱۰۱۔ غالب نام آورم از نادم سیتاپوری مطبوعہ لاہور)

علامہ فضل حق خیر آبادی کی بصیرت و مآل اندیشی، ہمت و شجاعت اور ان کے استقلال و استقامت پر قربان جایئے کہ ایک طرف لگ بھگ ۱۸۲۶ء میں وہ برطانوی اقتدار کو نظر انداز کرتے ہوئے باشندگانِ دہلی کی قیادت و نمائندگی کرتے ہوئے اپنے قدیم مرکز لال قلعہ سے ان کی وابستگی مضبوط کرنے کے لئے اکبر شاہ ثانی کے دروازے پر ایک جم غفیر کے ساتھ دستک دیتے ہیں اور دوسری جانب عین حالتِ اسیری میں جزیرۂ انڈمان سے اپنے ملک کے باشندوں کی اور خود اپنی داستانِ کرب و بلا (بشکل الثورۃ الھندیۃ و قصائد فتنۃ الھند) لکھ کر ۱۲۷۷ھ/ ۱۸۶۰ء میں مفتی عنایت احمد کاکوروی (متوفی ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۳ء) کے بدست انڈمان سے ہندوستان لکھ بھیجتے ہیں اور اس خطرناک و زہرہ گداز اقدام پر ان کے پائے ثبات میں ذرا بھی لغزش نہیں آئی کہ انگریز ظالموں کو اگر اس کی خبر لگ گئی تو پھر اس کا انجام کتنا بھیانک ہوگا؟ ایسے ہی اصحاب عزیمت و استقامت کی بارگاہ میں یہ شعر نذر کیے جانے کے لائق ہے اور صحیح معنوں میں یہی علمائے حق اس کے مستحق بھی ہیں کہ ان کے بارے میں کہا جائے۔

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

☆☆☆☆☆

۱۹ / ۷ / ۱۸

دار القلم دہلی

بفضلہ تعالیٰ دار القلم، ذاکر نگر، نئی دہلی ۲۵ (رجسٹرڈ) کے قیام سے ملک و بیرون ملک کے اکثر علما و طلبہ اور دینی و علمی مطالعہ کا شوق رکھنے والے سنی خواص و عوام بخوبی واقف ہیں۔ (۱) قادری مسجد (۲) لائبریری (۳) اسلامک ریسرچ اکیڈمی (۴) دار التصنیف و التالیف (۵) دار الترجمہ (۶) ٹریننگ سینٹر (۷) دار الاشاعت (۸) میگزین (۹) سیمینار ہال (۱۰) مطالعۂ مذاہب (۱۱) دعوت و اصلاح (۱۲) رابطۂ علمائے ہند (۱۳) عالمی رابطہ (۱۴) مہمان خانہ جیسے اہم شعبوں پر مشتمل دار القلم مستقبل قریب میں اہل سنت کے عظیم تحقیقی و تصنیفی مرکز اور تاریخ ساز ادارہ کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت بھی حاصل کرے گا۔ ان شاء اللہ

مطبوعاتِ دار القلم دہلی

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
(۱) قرآن اور جہاد	20/-	(۲) تعارف اہل سنت	15/-
(۳) تین برگزیدہ شخصیتیں	60/-	(۴) مسائل توسل و زیارت	30/-
(۵) امام احمد رضا: ارباب علم و دانش کی نظر میں	60/-	(۶) خصائص رسول	40/-
(۷) پیغام حجاز	15/-	(۸) تین طلاق کا شرعی حکم	20/-
(۹) موئے مبارک	22/-	(۱۰) سوادِ اعظم	20/-
(۱۱) جشنِ میلاد النبی	20/-	(۱۲) خاکِ حجاز	20/-
(۱۳) امام احمد رضا اور جدید افکار و تحریکات	90/-	(۱۴) انگریز نوازی کی حقیقت	60/-
(۱۵) آیاتِ جہاد کا قرآنی مفہوم	15/-	(۱۶) امام احمد رضا اور رد بدعات و منکرات	140/-
(۱۷) چند علمائے انقلاب (۱۸۵۷ء)	60/-	(۱۸) قائدِ جنگِ آزادی علامہ فضل حق خیرآبادی	60/-
(۱۹) علما و قائدین جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء	15/-	(۲۰) ۱۸۵۷ء: پس منظر و پیش منظر	100/-
(۲۱) اصلاحِ فکر و اعتقاد	140/-	(۲۲) مسلم پرسنل لا کا تحفظ	40/-
(۲۳) پیغامِ عمل	40/-	(۲۴) نقوشِ فکر (جلد اول و دوم)	500/-
(۲۵) قائدِ انقلاب علامہ فضلِ حق خیرآبادی	50/-	(۲۶) امامِ اعظم ابو حنیفہ	40/-

تاجرانِ کتب خصوصی رعایت کے ساتھ مندرجہ بالا کتب حاصل کریں۔ عام قارئین بذریعۂ منی آرڈر مطلوبہ کتب کی پچیس فی صد رقم پیشگی ارسال کرکے وی پی سے کتابیں منگائیں۔

جملہ خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ

دار القلم۔ قادری مسجد روڈ، ذاکر نگر، (جوگا بائی ایکسٹینشن) نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

فون: 011-26986872، فیکس نمبر: 011-26987184

DARUL QALAM

66/92, Qadri Masjid Road, Zakir Nagar, (Joga Bai Ext.)

New Delhi-25 (INDIA)